الرسالہ
Al-Risala

May 1995 • Issue 222 • Rs. 7

صبر کا وار تشدد کے وار سے زیادہ کارگر ہے
اور صبر وہ چیز ہے جو
ہر وقت اور ہر حال میں آدمی کے پاس موجود ہوتا ہے۔

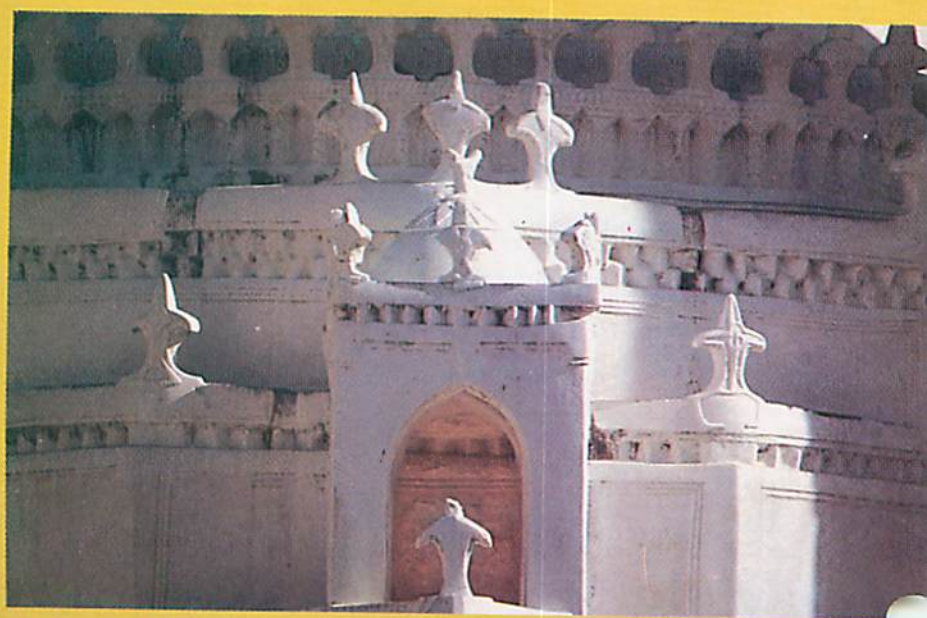

Great Mosque, Jiblah, Yemen

WOMAN BETWEEN ISLAM AND WESTERN SOCIETY

By Maulana Wahiduddin Khan

The status of woman in Islam is the same as that of man. Injunctions about honour and respect enjoined for one sex are enjoined equally for the other sex. So far as rights in this world and rewards in the Hereafter are concerned, there is no difference between the sexes. In the organization of daily living, both are equal participants and partners. Yet Islam sees man as man and woman as woman and, considering the natural differences, it advocates the principle of the division of labour between the two sexes rather than the equality of labour.

Price Rs. 85
ISBN 81-85063-75-3

AL-RISALA BOOKS
The Islamic Centre
(Publications Division)
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013
Tel. 4611128, 4697333
Fax: 91-11-4697333

Distributed by
UBS Publishers' Distributors Ltd.
5 Ansari Road, New Delhi 110 002
Bombay Bangalore Madras Calcutta Patna Kanpur London

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

مئی ۱۹۹۵ ، شمارہ ۲۲۲

فہرست	صفحہ	فہرست	صفحہ
آزمائش	۴	رجوع واعتراف	۱۳
صبر کی عبادت	۵	عبرت ناک	۱۵
تحدیات عصریہ	۶	جھوٹ کی بنیاد	۱۷
اختلاف رائے	۷	تخریبی منصوبہ ناکام	۱۸
بارڈر لائن	۸	سفرنامہ امریکہ — ۲	۱۹
فتنۂ مال	۹	ترک کلام	۴۲
ایک دن	۱۰	رواداری کا اصول	۴۳
کمال پیدا کیجئے	۱۱	خبرنامہ اسلامی مرکز	۴۷
انسان کا مستقبل	۱۲		

AL-RISALA (Urdu) Monthly
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013, Tel. 4611128, 4697333
Fax: 91-11-4697333
Single copy Rs. 7 □ Annual Subscrption Rs. 70/$ 20 (Air mail)
Printed and published by Dr Saniyasnain Khan at Nice Printing Press, Delhi

ایک آزمائش

قرآن میں ارشاد ہوا ہے : اور اسی طرح ہم نے شریر آدمیوں کو اور شریر جنوں کو ہر نبی کا دشمن بنا دیا۔ وہ ایک دوسرے کو پرفریب باتیں سکھاتے ہیں دھوکا دینے کے لئے۔ اور اگر تیرا رب چاہتا تو وہ ایسا نہ کر سکتے۔ پس تم انھیں چھوڑ دو کہ وہ جھوٹ باندھتے رہیں۔ اور ایسا اس لئے ہے کہ اس کی طرف ان لوگوں کے دل مائل ہوں جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے۔ اور تاکہ وہ اس کو پسند کریں، اور تاکہ جو کمائی انھیں کرنی ہے وہ کر لیں (الانعام ۱۴ - ۱۱۳)

یہ معاملہ اس وقت پیش آتا ہے جب کہ حق کی دعوت اپنی بے آمیز صورت میں سامنے آجائے۔ جو لوگ خود ساختہ مذہب کی بنیاد پر مقبولیت حاصل کئے ہوئے ہوتے ہیں، وہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ دعوت ان کو بے اعتبار ثابت کر رہی ہے۔ چنانچہ وہ اس کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ اب چوں کہ دعوت حق کو دلیل سے رد کرنا ان کے لئے ممکن نہیں ہوتا، اس لئے وہ عیب جوئی اور کردار کشی کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔

یہ مخالفین اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے بے بنیاد شوشے نکالتے ہیں۔ وہ داعی کے خلاف الزام بازی کی مہم چلاتے ہیں۔ وہ اس کی ذات کو بدنام کرنے کے لئے پرفریب باتیں پھیلاتے ہیں۔ یہ صورتحال ہر آدمی کو برہنہ کر دیتی ہے۔ ایک طرف وہ لوگ ہوتے ہیں جن کو اللہ کے خوف نے آخری حد تک سنجیدہ بنا دیا ہے۔ ان کی بڑھی ہوئی سنجیدگی اس بات کی ضمانت بن جاتی ہے کہ وہ دلیل اور عیب جوئی میں فرق کر سکیں۔ مگر جن لوگوں کے دل خدا کی پکڑ کے احساس سے خالی ہو جاتے ہیں، وہ سنجیدہ غور و فکر سے بھی محروم ہوتے ہیں۔ یہ دوسری قسم کے لوگ آسانی سے اس پرفریب پروپگنڈے کا شکار ہو جاتے ہیں۔

یہ صورتحال امتحان کی غرض سے ہے۔ اس لئے وہ لازماً باقی رہے گی۔ اس دنیا میں بہرحال آدمی کو اس آزمائش میں کھڑا ہونا ہے کہ وہ سچی دلیل اور بے بنیاد بات میں فرق کرے۔ وہ بے بنیاد بات کو رد کر کے سچی دلیل کو قبول کر لے۔ الفاظ کی آزمائش سب سے بڑی آزمائش ہے کامیاب وہ ہے جو اس نازک آزمائش میں کامیاب رہے۔

۴ الرسالہ مئی ۱۹۸۵

صبر کی عبادت

نماز کا وقت ہو اور مسجد سے اذان کی آواز آئے تو ایک مسلمان خوش ہوتا ہے کہ اس کے لئے وقت آگیا کہ وہ نماز ادا کرے اور عبادت کا ثواب حاصل کرے۔ اسی طرح جب رمضان کا نیا چاند آسمان پر نظر آتا ہے تو مسلمان خوش ہوتے ہیں کہ رمضان کے مہینہ کی آمد نے ان کو موقع دیا کہ وہ روزہ رکھ کر اپنے آپ کو اس کے ثواب کا مستحق بنائیں۔

اسی طرح ایک اور عظیم عبادت ہے جس کو شریعت میں صبر کہا گیا ہے۔ قرآن میں ہے کہ صبر کرنے والوں کو بے حساب اجر دیا جائے گا۔ (الزمر ۱۰) حدیث میں ہے کہ صبر سے زیادہ بہتر عطیہ کبھی کسی کو نہیں دیا گیا (ولن تعطوا عطاء خیراً و أوسع من الصبر) صبر ایک عبادت ہے، بلکہ تمام عبادتوں میں سب سے بڑی عبادت۔

عصر کی نماز کا ثواب بہت زیادہ ہے، مگر آپ عصر کی نماز دوپہر کے وقت نہیں پڑھ سکتے۔ اسی طرح رمضان کے روزہ کے لئے غیر معمولی ثواب کی خوش خبری دی گئی ہے۔ مگر یہ ثواب محرم کے مہینہ میں روزہ رکھ کر حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ یہی معاملہ صبر کی عبادت کا بھی ہے۔ صبر کی عبادت صبر کے حالات میں انجام دی جاسکتی ہے، غیر صابرانہ حالات میں صبر کی عبادت کی انجام دہی ممکن نہیں۔

صبر کا موقع کب پیش آتا ہے۔ صبر کا موقع اس وقت پیش آتا ہے جبکہ آپ کے ساتھ اشتعال انگیزی کی جائے۔ آپ کے ساتھ برا برتاؤ کیا جائے۔ جب کوئی شخص ایسی بات کہے جس سے آپ کی انا پر چوٹ لگتی ہو۔ صبر پر عمل کرنے کا موقع ہمیشہ مخالفانہ حالات میں ہوتا ہے نہ کہ موافقانہ حالات میں۔

صبر کے حالات پیش آنے پر اکثر لوگ بھڑک اٹھتے ہیں۔ وہ منفی نفسیات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اگر وہ شعوری طور پر جانیں کہ یہ تو ان کے لئے صبر کی عبادت کا موقع ہے تو وہ صبر کے وقت کا اسی طرح استقبال کریں جس طرح وہ نماز اور روزہ کے وقت کا استقبال کرتے ہیں۔

صبر کا موقع عبادت کا موقع ہے۔ ایسا موقع پیش آنے پر آدمی کو یقین کرنا چاہئے کہ وہ وقت آگیا جب کہ عبادتِ عظیم کا ثبوت دے کر وہ ثوابِ عظیم کا مستحق بن جائے۔

تحدیات عصریہ

اکتوبر ۱۹۹۴ میں دار العلوم دیوبند میں مدارس اسلامیہ عربیہ کا ایک کل ہند اجتماع ہوا۔ اس موقع پر دار العلوم کے مہتمم مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب نے خطبۂ صدارت پیش کیا۔ اس مفصل خطبہ میں ایک بحث "مدارس دینیہ اور عصری علوم" کی ہے۔ مہتمم صاحب کا ارشاد ہے کہ مدارس دینیہ کے عربی نصاب کے ساتھ علوم عصریہ کو جوڑنے کی تجویز غیر دانش مندانہ ہے۔ مدارس دینیہ کا نصاب خالص دینی علوم پر مشتمل رہنا چاہئے۔ اس میں علوم عصریہ کی آمیزش نہیں ہونا چاہئے (الفرقان، نومبر۔ دسمبر ۱۹۹۴)

جو لوگ اس قسم کا خیال رکھتے ہیں انھیں جاننا چاہئے کہ اصل مسئلہ علوم عصریہ کا نہیں ہے بلکہ تحدیات عصریہ کا ہے۔ خود مدارس اسلامیہ کے مقاصد کے تحت ہی یہ ضروری ہے کہ زمانہ حاضر کی فکری تحدیات کو مع ان کے جواب کے داخل نصاب کیا جائے۔ ورنہ مدارس کا اصل مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔

مدارس اسلامیہ کا اولین مقصد دینی رہنما اور داعی تیار کرنا ہے۔ کوئی عالم مخالف اسلام نظریات سے واقفیت کے بغیر یہ کام انجام نہیں دے سکتا۔ اسی لئے علماء سلف نے مدارس کے نظام میں وقت کے فرق باطلہ کا تعارف اور ان کا رد نصاب تعلیم میں شامل کیا تھا۔ اسی طرح انھوں نے یونانی فلسفہ کو اسلامائز کر کے اس کو معقولات کے طور پر نصاب میں شامل کیا۔

مگر یہ سب دور قدیم کی تحدیات تھیں۔ اب وہ قصۂ پارینہ بن کر ماضی کی تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں۔ خود اصول نصاب کا یہ تقاضا ہے کہ ان قدیم معقولات کی جگہ جدید معقولات کو مدارس کے نصاب میں داخل کیا جائے۔ یہ کام نہ ہونے ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ ہمارے مدارس ایسے علماء تیار کر رہے ہیں جو تحدیات قدیمہ کو تو جانتے ہیں اور اس پر گفت گو کر سکتے ہیں۔ مگر تحدیات جدیدہ کی انھیں مطلق خبر نہیں۔ وہ نہ ان جدید تحدیات کو جانتے اور نہ اسلام کی طرف سے ان کا جواب دے سکتے۔ موجودہ علماء اسلام کی طرف سے عصری فتنوں کا دفاع کرنے میں ناکام ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو اپنی تعلیم گاہوں میں نہ ان فتنوں کا تعارف کرایا گیا اور نہ ان کے مقابلہ میں اسلام کی نمائندگی کرنے کے لئے انھیں تیار کیا گیا۔

اختلاف رائے

مولانا محمود حسن دیوبندی (۱۹۲۰-۱۸۵۱) تحریک خلافت کے پُرجوش حامیوں میں سے تھے۔ ان کے شاگرد مولانا اشرف علی تھانوی (۱۹۴۳-۱۸۶۳) تحریک خلافت کے مخالف تھے۔ وہ اس تحریک پر کھلم کھلا تنقید کرتے تھے۔ مگر استاد نے اپنے شاگرد کی اس "گستاخی" کو کبھی برا نہیں مانا۔ دونوں کے درمیان آخر وقت تک مخلصانہ تعلق باقی رہا۔

مولانا اشرف علی تھانوی ایک گفتگو کے ذیل میں اپنے استاد اور شیخ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"حضرت کے قلب پر میرے اختلاف سے ذرہ برابر بھی گرانی نہ تھی۔ ایک مرتبہ تحریک خلافت کے زمانہ میں حضرت کی بیٹھک میں کچھ لوگ بیٹھے ہوئے میرے متعلق برے برے الفاظ کہہ رہے تھے۔ کچھ الفاظ حضرت کے کانوں میں پڑ گئے۔ باہر تشریف لے آئے۔ بہت خفا ہوئے اور یہ فرمایا کہ خبردار، جو آئندہ ایسے الفاظ کبھی استعمال کئے۔ اور یہ فرمایا کہ میرے پاس کیا وحی آتی ہے کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں وہ سب ٹھیک ہے۔ میری بھی ایک رائے ہے، اس کی بھی ایک رائے ہے۔ ایک مرتبہ حضرت نے یہ فرمایا کہ ہمیں تو اس پر فخر ہے کہ جو شخص تمام ہندستان سے بھی متاثر نہ ہوا اور کسی کی بھی پروا نہ کی وہ بھی ہماری ہی جماعت سے ہے۔"

ملفوظات حکیم الامت، مولانا اشرف علی تھانوی، ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان، صفحہ ۱۱۴

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اختلاف کے معاملہ میں علماء امت کا طریقہ کیا ہونا چاہئے۔ اس طرح کے اختلافات میں وہی روح کارفرما ہونی چاہئے جس کو امام شافعی نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے: میری رائے درست ہے، مگر احتمالِ خطا کے ساتھ، دوسرے کی رائے غلط ہے مگر احتمال صحت کے ساتھ۔ (رأئی صواب یحتمل الخطأ ورأئ غیری خطأ یحتمل الصواب)

یہ اختلافات عام طور پر اجتہادی امور میں ہوتے ہیں اور اجتہادی امور میں ہمیشہ ایک سے زیادہ رائے کی گنجائش ہوتی ہے۔ اس لئے صحیح ترین مسلک یہ ہے کہ آدمی اختلاف کے باوجود اپنے آپ کو فریق ثانی کی نفرت سے بچائے۔ وہ اپنے نقطۂ نظر کو شدت کے ساتھ پیش کرے، اس کے باوجود اس کی نفسیات یہ ہو کہ یہ معاملہ ۵۰ فیصد اور ۵۰ فیصد کا ہے نہ کہ صد فی صد کا۔

بارڈر لائن

۹ نومبر ۱۹۸۹ کا واقعہ ہے۔ ایک صاحب دہلی میں میرے کمرہ میں داخل ہوئے۔ تندرست جسم، شاندار شخصیت، گفت گو کا انداز نہایت مؤثر، ان کو دیکھکر مجھے رشک آیا۔ ان کے واپس جانے کے بعد بھی دیر تک میں ان کے بارہ میں سوچتا رہا۔ یہ پاکستان کے مولانا کوثر نیازی تھے۔ انھوں نے میری ڈائری میں اپنا پتہ اور ٹیلیفون نمبر لکھا تو اس میں اپنا نام "سینیٹر کوثر نیازی" تحریر کیا۔

اس کے بعد ان سے دوبارہ ملاقات نہ ہو سکی۔ یہاں تک کہ اخبار کے ذریعہ معلوم ہوا کہ ۱۹ مارچ ۱۹۹۴ کو اسلام آباد میں ان کا انتقال ہو گیا۔ انتقال کے وقت وہ اسلامی نظریاتی کونسل کے چیرمین تھے۔ صرف ۵۱ سال کی عمر میں وہ اس دنیا سے چلے گئے۔

لاہور کے روزنامہ نوائے وقت (۱۹ مارچ ۱۹۹۴) میں ان کے انتقال سے ایک دن پہلے کی تفصیلات پڑھیں۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ "مولانا کوثر نیازی جنھیں دماغ کی رگیں پھٹنے کے باعث ہسپتال کمپلکس میں داخل کیا گیا تھا، جمعہ کو ماہر ڈاکٹروں کی ایک ٹیم نے ان کے دماغ کا آپریشن کیا۔ مولانا کو انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں رکھا جا رہا ہے۔ جہاں ڈاکٹروں کی ٹیم ان کی جان بچانے کے لئے مصروف ہے۔ ان پر غشی طاری ہے۔ صدر اور وزیر اعظم نے ان کے لئے گلدستے بھجوائے۔ رات گئے ہسپتال کمپلکس کے ڈاکٹروں نے نوائے وقت کو بتایا کہ مولانا کی جان بچانے کے لئے انسانی حد تک تمام کوششیں کر رہے ہیں مگر ان کی حالت اس قدر تشویشناک ہے کہ اب وہ بارڈر لائن پر پہنچ گئے ہیں۔ (صفحہ ۵)

غور کیجئے تو ہر آدمی بارڈر لائن پر ہے۔ کیوں کہ ہر آدمی ہر لمحہ موت کے کنارے ہے۔ کسی بھی وقت اس کی موت آسکتی ہے۔ کسی بھی آدمی کے بارہ میں یہ معلوم نہیں کہ وہ کب تک زندگی کے اِس پار ہے اور کب وہ اچانک زندگی کے اُس پار چلا جائے گا۔

میڈیکل ڈاکٹر کسی ایسے ہی شخص کے بارہ میں بارڈر لائن پر ہونے کا اعلان کرتے ہیں جس کا کیس مولانا کوثر نیازی جیسا بن گیا ہو۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے ہر آدمی کا کیس یہی ہے۔ آدمی کو اگر اس سنگینی کا احساس ہو تو وہ جیتے جی اپنے آپ کو موت کے کنارے سمجھے، زندگی سے زیادہ وہ اپنے آپ کو موت کے قریب کھڑا ہوا پائے۔

فتنۂ مال

محمد صلاح الدین صاحب پاکستان کے معروف صحافی تھے۔ کراچی سے ان کا ہفت روزہ تکبیر نکلتا تھا۔ وہ اپنے قلم سے سیاسی نشتر کا کام لیتے تھے۔ ان کو پاکستان میں "بے باک صحافت کا امام" کہا جاتا تھا۔ ۴ دسمبر ۱۹۹۴ کو کراچی میں گولی مار کر انھیں قتل کر دیا گیا۔ بوقت وفات ان کی عمر ۵۶ سال تھی۔ صلاح الدین صاحب کے ایک دوست ڈاکٹر محمد فاروق خاں صاحب ان کے بارہ میں لکھتے ہیں:

"عمر کا ایک بڑا حصہ انھوں نے کراچی میں ٹین کی چھت والے ایک گھر میں گزارا۔ ان کی ساری زندگی کی کمائی بس ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ تین برس پہلے کی بات ہے، ان کے دفتر سے ان کے گھر تک ہم ڈیڑھ گھنٹے میں بس کے ذریعہ سے اس طرح پہنچے کہ ہم دونوں سارے راستہ میں کھڑے رہے۔ گھر پہنچے تو ان کی بیٹھک اتنی چھوٹی تھی کہ مجھے گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ وفات سے چار دن قبل لاہور میں ہم سب کھانے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ حلیم (سالن) کا ذکر چھڑ گیا تو انھوں نے ایک دلچسپ واقعہ سنایا۔ کہنے لگے کہ ایک زمانہ میں ہم سب دوست باری باری دعوت کیا کرتے تھے۔ جب میری باری آئی تو حلیم کی فرمائش ہوئی۔ وہی ٹین کی چھت والے گھر میں احباب جمع تھے۔ ماہر القادری صاحب کھا چکے تو انھوں نے کہا: ارے تم نے یوں ہی اپنی زندگی صحافت میں خوار کر لی۔ اس کے بجائے اگر حلیم کی دو دیگیں صبح و شام پکا کر بیچتے تو اب تک تمہارا بنگلہ بن چکا ہوتا۔"

(ماہنامہ اشراق، لاہور، جنوری ۱۹۹۵ صفحہ ۱۳)

یہ لطیفہ موجودہ زمانہ کے ایک دردناک پہلو کو بتاتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں علم اور دین کے شعبوں میں مادی فوائد بہت کم ہو گئے۔ اس کے بجائے دنیوی اور مادی شعبوں میں مالی فوائد بے پناہ حد تک بڑھ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اعلیٰ ذہن اور اعلیٰ صلاحیت کے لوگ غیر دینی شعبوں کی طرف بھاگ گئے۔ اور دینی شعبوں میں کام کرنے کے لئے صرف تیسرے درجہ کے لوگ باقی رہے۔

موجودہ زمانہ میں دین کا کوئی اعلیٰ کام نہیں ہو رہا ہے۔ کیوں کہ اعلیٰ کام اعلیٰ صلاحیت کے لوگ کرتے ہیں اور ایسے تمام لوگ اب "حلیم" کے کاروبار میں لگ گئے۔

ایک دن

دہلی میں مہرولی کے علاقہ میں ایک اسلامی ادارہ مدرسہ اسلامیہ عربیہ فیض القرآن کے نام سے ہے۔ اس کو مولانا محمد طلحہ صاحب اور مولانا بشیر احمد راشد الامینی نے ۱۹۹۲ میں قائم کیا تھا۔ ۲۴ جولائی ۱۹۹۴ کو اس کا پہلا دینی تعلیمی جلسہ ہوا۔ اس کے مہمان خصوصی مولانا محمد صدیق باندوی تھے۔ اس کی دعوت پر راقم الحروف نے بھی اس میں شرکت کی۔

نظام الدین سے روانہ ہو کر ہم دہلی کے مختلف حصوں سے گزرے۔ جب ہم مہرولی میں داخل ہوئے تو قطب مینار پر نظر پڑی جو اس علاقہ کی سب سے بلند عمارت کے طور پر دور دور سے دکھائی دیتا ہے۔ قطب مینار تیرھویں صدی عیسوی میں قطب الدین ایبک نے بنوایا تھا۔ اس کی بابت تاریخ میں یہ الفاظ درج ہیں کہ دہلی کا قطب مینار ابھی تک قطب الدین ایبک کی فتوحات کی یاد دلاتا ہے:

The Qutub Minar in Delhi still stands to commemorate his victories. (VIII/362)

مگر اس کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ یہ مینار اپنی بلندیوں کے ساتھ اس سے بھی زیادہ بڑی ایک حقیقت کی یادگار ہے۔ اور وہ یہ کہ کامیابی عمل سے ملتی ہے نہ کہ پیدائش سے۔

قطب الدین ایبک ابتداً ایک غلام کی حیثیت سے محمد غوری کی ملازمت میں آیا۔ اس کے بعد اپنی ممتاز کارکردگی کی بنا پر اس نے ترقی شروع کی۔ یہاں تک کہ سلطان محمد غوری کے قتل (۱۲۰۶ء) کے بعد وہ اس کا جانشیں بنا۔ اور پھر اپنی حکیمانہ تدبیروں سے وہ دہلی کی سلطنت کا مالک بن گیا۔ اگرچہ وہ زیادہ دنوں تک حکومت نہ کر سکا۔ گھوڑوں کے ایک کھیل میں وہ شدید طور پر زخمی ہو گیا۔ اسی میں ۱۲۱۰ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

اس دنیا میں کامیابی کے امکانات بے شمار ہیں۔ یہاں ایک معمولی انسان بھی بادشاہ کے درجہ تک پہنچ سکتا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ اپنی خداداد صلاحیتوں کو حکیمانہ طور پر استعمال کرے۔

کمال پیدا کیجئے

۲۵ مارچ ۱۹۹۲ کو ملبورن میں ورلڈ کرکٹ کپ کا فائنل مقابلہ تھا۔ پاکستان کی ٹیم نے انگلینڈ کی ٹیم کو ہرا کر ورلڈ کپ جیت لیا۔ پاکستان کی ٹیم کو یہ غیر معمولی کامیابی اس کی ٹیم کے کیپٹن عمران خاں کی قیادت کے تحت حاصل ہوئی۔ اس کے بعد نہ صرف پاکستان بلکہ ساری دنیا سے عمران خاں کے لئے مبارک باد کے پیغامات کا سیلاب امنڈ پڑا۔ ٹائمس آف انڈیا (۲۶ مارچ) نے اس خبر کی سرخی ان الفاظ میں قائم کی:

Pakistan rule the world with a flawless display.

اس سلسلہ میں ہندستان کے مشہور کھلاڑی مسٹر منوج پربھاکر کا انٹرویو اخباروں میں شائع ہوا ہے۔ اس کو ویڈیو میگزین اسپورٹس چینل (Sports Channel) نے ریکارڈ کیا تھا۔ مسٹر پربھاکر نے کہا:

India needed an Imran Khan-like captain to motivate the team. I think there should be some gap like age between the team and captain. You can see the way Imran is doing his job. He is marvellous. We need that type of captain who can be a good leader. That is what we need.- Otherwise we have the best team.

انڈیا کو عمران خاں جیسے ایک کیپٹن کی ضرورت ہے جو ہماری ٹیم کو متحرک کرے۔ میرا خیال ہے کہ ٹیم اور کیپٹن میں عمر کی طرح کچھ فرق ہونا چاہئے۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ عمران کس طرح اپنا کام کر رہے ہیں۔ وہ ایک حیرت انگیز شخص ہیں۔ ہم کو اسی قسم کے کیپٹن کی ضرورت ہے جو ایک اچھا قائد بن سکے۔ یہ ہے وہ چیز جس کی ہمیں ضرورت ہے۔ ورنہ ہمارے پاس بہترین ٹیم ہے۔ (ٹائمس آف انڈیا، ہندستان ٹائمس ۲۶ مارچ ۱۹۹۲)

انسان کمال کو پسند کرتا ہے۔ کوئی شخص کمال کا مظاہرہ کرے تو دیکھنے والا اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ کمال موافقت اور مخالفت سے بلند ہو کر اپنے آپ کو منوا لیتا ہے۔ کسی بھی میدان میں اگر آپ کمال پیدا کر لیں تو انسان آپ کی قدردانی اور اعتراف پر مجبور ہو جائے گا، خواہ بظاہر آپ غیر قوم کے فرد کیوں نہ ہوں۔

انسان کا مستقبل

گیانی ذیل سنگھ ۱۹۱۶ میں راجکوٹ (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ ان کا باپ ایک غریب بڑھئی تھا۔ ان کی باقاعدہ تعلیم بھی نہ ہوسکی۔ انھوں نے سیاست میں حصہ لے کر شہرت پائی۔ ۱۹۴۷ کے بعد وہ منسٹر اور چیف منسٹر بنے۔ آخر میں وہ انڈیا کے صدر مقرر ہوئے۔ اس طرح پنجاب کے ایک جھونپڑے سے زندگی شروع کرکے وہ دہلی کے راشٹرپتی بھون تک پہنچ گئے۔

۲۹ نومبر ۱۹۹۴ کو ان کی کار کے ساتھ حادثہ پیش آیا۔ اس کے بعد انھیں چنڈی گڑھ کے نہرو ہاسپٹل میں داخل کر دیا گیا۔ مگر وہ صحت یاب نہ ہوسکے۔ ۲۵ دسمبر ۱۹۹۴ کو ان کا انتقال ہوگیا۔ "جھونپڑے" سے زندگی شروع کرنے والا دوبارہ "جھونپڑے" کی طرف لوٹ گیا۔

اخبار میں جس دن میں نے گیانی ذیل سنگھ کی وفات کی خبر پڑھی، اسی دن ایک پرچہ میں ایک کارٹون نظر سے گزرا۔ اس میں ایک بوڑھے موٹے آدمی کو کرسی پر بیٹھا ہوا دکھایا گیا تھا۔ بڑھاپے سے وہ نڈھال ہو رہا تھا۔ کارٹون کے ساتھ یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے ... میں نے سخت محنت کی اور اتنی دولت اکٹھا کرلی جو میری تمام ضرورتوں کے لئے کافی ہو۔ مگر اب میں اتنا زیادہ بوڑھا ہوچکا ہوں کہ میں اپنی دولت سے لطف اندوز نہیں ہوسکتا:

I've worked hard. And finally amassed all the money I'll ever need. But I'm too old to enjoy it.

یہی ہر انسان کی کہانی ہے۔ آدمی اپنے جسم اور اپنے دماغ کی ساری طاقت خرچ کرکے مادی ترقی حاصل کرسکتا ہے۔ مگر جب وہ اپنی مادی ترقی کی آخری حد پر پہنچتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترقی اس کے کسی کام کی نہیں۔ ترقیوں کے ڈھیر میں وہ ایک بے ترقی کا کیس بن کر رہ جاتا ہے۔ کیسا عجیب ہے انسان کا یہ معاملہ، وہ صرف اپنے ماضی اور اپنے حال کا مالک ہے، اپنے مستقبل پر اس کو کوئی اختیار حاصل نہیں۔

اس دنیا میں دولت مندی بھی ویسی ہی ہے جیسے غریبی۔ یہاں محل کی زندگی بھی اتنی ہی بے حقیقت ہے جتنا کہ جھونپڑے کی زندگی۔

رجوع و اعتراف

"المجلة" عربی کا مشہور میگزین ہے۔ وہ جدہ (سعودی عرب) میں چھپتا ہے اور لندن سے شائع ہو کر ساری دنیا میں پہنچتا ہے۔ اس میگزین کے شمارہ ۵۔ ۱۱ دسمبر ۱۹۹۳ (۲۲ — ۲۸ جمادی الآخرہ ۱۴۱۴ھ) میں لیبیا کے صدر معمر القذافی کا خصوصی انٹرویو اس عنوان کے تحت چھپا ہے: القذافی یعترف: الانقلابات والثورات لم تحقق المطلوب۔ اس انٹرویو کا ایک سوال وجواب یہ ہے:

هل يمكن ان توضح لنا الفارق بين عهد الشباب الماضي ثم عهد النضج الحالي؟

– كنا في الماضي نحرص على الثورة من اجل اقامة الوحدة العربية مثلاً، وكنا نحرص على الدعوة الى الحرب من اجل تحرير فلسطين. لكن وضع الثورات في الوطن العربي في الماضي وبعده اثبت انه ليس من الضروري ان يقع انقلاب حتى تتحقق هذه الأهداف. عاصرت خمسة او ستة انقلابات في موريتانيا، ومثلها اليمن وكذلك السودان. وعاصرت تغيراً في الحكام. فقد مر على اليمن الشعبي وسالم البيض وصالح وعلي عنتر وعبد الفتاح والغشمي والحمدي. كلهم عاصرتهم، والسودان مثلا مر عليه النميري والصادق المهدي وسوار الذهب وسوار الفضة (ضاحكاً) وان شاء الله نقف عند الفضة. عاصرت انقلابات واغتيالات وتغييرات ولكنها لم تؤد الى حل. والذي يمكن تطويره هو هذه الأنظمة لتصبح مثل اوروبا، أي تصل الى الوحدة بالاقناع. يمكن الاقناع ان يوصلنا الى تغيير ميثاق الجامعة العربية واقامة وحدة اقتصادية ودفاعية. وكل يبقى في مكانه. فالملك ملك، والرئيس رئيس، والسلطان سلطان. فقد ثبت لنا ان تصفية الرموز ليست هي الحل. واما حرب فلسطين فانظر الى جنوب افريقيا صار فيها حل بدون حرب بعد ان كنت اقول انه يجب ابادة البيض. ليس ضروريا ان نشن الحرب (لتحرير فلسطين) فلو يرجع الشعب الفلسطيني الى ارضه ويكون هناك خمسة او ستة ملايين في دولة مع اليهود ضمن ديموقراطية لوجد الحل.

سوال: کیا آپ وضاحت کے ساتھ ہمیں بتائیں گے کہ آپ کے گزشتہ عہد جوانی اور موجودہ پختگی کے دور میں کیا فرق ہے؟

جواب: پہلے ہم مثال کے طور پر عرب اتحاد قائم کرنے کے لئے انقلاب پر ابھارتے تھے۔ آزادیٔ فلسطین کے بارے میں جنگ کی باتیں کیا کرتے تھے۔ لیکن عالم عربی میں ماضی وحال کے انقلابات کی

صورتحال نے ثابت کیا ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ پہلے کوئی انقلاب برپا کیا جائے تب ہی مذکورہ مقاصد حاصل ہوں گے۔ میں اپنے زمانے میں موریتانیا کے اندر پانچ یا چھ انقلابات دیکھ چکا ہوں۔ یہی حال یمن اور سوڈان کا ہے۔ میں نے حکمرانوں کو بدلتے ہوئے دیکھا ہے۔ یمن میں الشعبی، سالم البیض، صالح، علی عنتر، عبد الفتاح، الغشمی، الحمدی، یہ سب میرے معاصر رہے ہیں۔ اسی طرح سوڈان میں مثلاً نمیری تھے ان کے بعد صادق المہدی آئے، پھر سوار الذہب اور سوار الفضہ۔ میرے زمانے میں کئی انقلابات، حکمرانوں کے قتل اور حکومتوں کی تبدیلی کے واقعات ہوئے مگر وہ سب کے سب بے سود ثابت ہوئے۔ جس چیز کو بدلنا اور ترقی دینا ممکن ہے وہ ہمارا موجودہ طریق کار ہے تاکہ وہ یورپ کی طرح ہو جائے۔ یعنی اتحاد کے حصول کے لئے (بات چیت کے ذریعہ) یقین دہانی کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ اس طریقہ کو استعمال کرکے ہم عرب لیگ کے دستور کو بدل سکتے ہیں اور اپنے درمیان ایک اقتصادی اور دفاعی اتحاد قائم کر سکتے ہیں۔ ہر شخص جہاں ہے وہ وہیں رہے، بادشاہ اپنی جگہ صدر اپنی جگہ، سلطان اپنی جگہ۔ کیوں کہ تجربہ سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اس قسم کی علامتوں کو ہٹانا ہمارے مسئلہ کا حل نہیں۔ جہاں تک جنگ فلسطین کا معاملہ ہے تو اس سلسلہ میں جنوبی افریقہ کو دیکھئے جہاں جنگ کے بغیر اسی نوعیت کا مسئلہ حل کر لیا گیا۔ جب کہ اس سے پہلے میرا کہنا تھا کہ سفید فام نسل کو نابود کئے بغیر وہ حل ہونے والا نہیں۔ آزادئ فلسطین کے لئے بھی ضروری نہیں کہ ہم جنگ چھیڑیں۔ اگر فلسطینی لوگ اپنی سرزمین میں واپس آجائیں اور ان کی ۵ یا ۶ ملین تعداد یہودیوں کے ساتھ ایک جمہوری نظام حکومت میں شرکت پر راضی ہو جائے۔ تو بالآخر ان کا مسئلہ مکمل طور پر حل ہو جائے گا۔

معمر قذافی نے لیبیا کے سابق شاہ ادریس کو ملک کی خرابیوں کا اصل سبب سمجھا اور فوجی انقلاب کے ذریعہ ۱۹۶۹ میں ان کا خاتمہ کر دیا۔ مگر انقلاب کے باوجود وہ نتائج حاصل نہ ہو سکے جو اس سے متوقع تھے۔ یہی حال اکثر مسلم ملکوں میں ہوا ہے۔ ہر انقلاب صرف افراد کی تبدیلی کے ہم معنی ثابت ہوا نہ کہ حالات کی تبدیلی کے ہم معنی۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی حکمراں کو برائی کی علامت قرار دے کر اس کے خلاف مہم چلانا ایک طفلانہ حرکت ہے۔ اس قسم کی تحریکیں اپنے نتیجہ کے اعتبار سے صرف تخریبی تحریکیں ہیں، ان کو انقلابی اور اصلاحی تحریک وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس کو نہ تاریخ کی خبر ہو اور نہ انسانی نفسیات کی۔

عبرت ناک

عراق کے صدر صدام حسین نے ۲ اگست ۱۹۹۰ کو اپنی فوجیں کویت میں داخل کر دیں اور اس پر قبضہ کر لیا۔ یہ واضح طور پر ایک جارحانہ فعل تھا۔ اس کے بعد ۶ اگست کو بغداد میں امریکہ کے قائم مقام سفیر جوزف ولسن نے صدام حسین سے ملاقات کی اور انھیں امریکی صدر جارج بش کا پیغام پہنچایا۔ امریکی سفیر نے ڈپلومیٹک انداز میں صدام حسین کو متنبہ کیا کہ انھوں نے جارحیت کا فعل کیا ہے۔ کویت سے ان کے جو اختلافات تھے، اس کو انھیں باہمی بات چیت سے حل کرنا چاہئے تھا نہ کہ طاقت کے استعمال سے۔ صدام حسین اس وقت فاتحانہ جوش میں تھے۔ انھوں نے امریکی سفیر کو جو جواب دیا وہ انگریزی رپورٹنگ میں ان الفاظ میں نقل کیا گیا تھا:

Give my regards to President Bush and tell him that Al-Sabah family has now become history.

صدر بش کو میرا سلام پہنچائیے اور ان سے کہہ دیجئے کہ کویت کا شاہی خاندان الصباح اب تاریخ کا ایک حصہ بن چکا ہے۔ صدام حسین نے اس کے اگلے دن ۷ اگست کو مزید یہ اعلان کر دیا کہ کویت اب 'کویت' نہیں رہا۔ وہ اب عراق کا ۱۹ واں صوبہ ہے۔

مگر کہانی یہیں ختم نہیں۔ اس کے بعد کویت کی درخواست پر امریکہ براہ راست سامنے آگیا۔ اس نے صدام حسین کو وارننگ دی کہ وہ ۱۵ جنوری ۱۹۹۱ تک اپنی فوجیں کویت سے نکال کر واپس لے جائیں۔ مگر صدام حسین نے اس الٹی میٹم کو نظر انداز کر دیا۔ اس کے بعد ۱۷ جنوری ۱۹۹۱ کو امریکہ نے عراق کے اوپر زبردست حملہ کیا۔ صدام کی فوجیں اس کے دفاع میں سراسر ناکام رہیں۔ یکم مارچ ۱۹۹۱ کو یہ جنگ عراق کی بدترین شکست پر ختم ہوگئی۔

اس کے بعد امریکہ نے چاروں طرف سے عراق کی ناکہ بندی کر دی۔ اس ناکہ بندی نے عراق کی اقتصادیات کو تباہ کر دیا۔ چنانچہ صدام حسین نے مجبور ہو کر امریکہ کے تمام مطالبات کو مان لیا۔ آخر کار ۱۰ نومبر ۱۹۹۴ کو صدام حسین کی قیادت میں عراقی پارلیمنٹ کا اجلاس ہوا۔ اس میں متفقہ طور پر یہ رزولیوشن پاس کیا گیا کہ عراق ایک آزاد ریاست (independent state) کے طور پر

کویت کو تسلیم کرتا ہے۔

عراق کے ڈپٹی پرائم منسٹر طارق عزیز نے ۱۴ نومبر ۱۹۹۴ کو اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل سے نیویارک میں ملاقات کی اور ان کو تحریری طور پر عراق کے اس فیصلہ سے مطلع کر دیا۔ (ٹائمس آف انڈیا ۱۵ نومبر ۱۹۹۴)

صدام حسین کویت کو تاریخ کا حصہ بنانا چاہتے تھے مگر وہ خود تاریخ کا حصہ بن گئے۔ اس فعل سے انھوں نے ثابت کیا کہ وہ صرف اپنے حال کو جانتے تھے، اپنے مستقبل کے بارہ میں وہ آخری حد تک بے خبر بنے ہوئے تھے۔

یہی موجودہ دنیا میں ہر انسان کی کہانی ہے۔ ہر آدمی اپنے آج کو جانتا ہے، اپنے کل کو وہ نہیں جانتا۔ اپنی کارروائی کی اسے خبر ہے، مگر خدا کے فرشتے اس کے خلاف جو کارروائی کر رہے ہیں، اس کی اسے خبر نہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں دوسروں کے بارہ میں فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں ہوں، حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ خود اپنے بارہ میں فیصلہ کرنے کی طاقت سے بھی محروم ہے۔

صدام حسین کا یہ انجام اللہ تعالیٰ کی ایک نشانی ہے۔ ایسے واقعات اس لئے پیش آتے ہیں تاکہ لوگ جان لیں کہ اسی قسم کا شدید تر انجام ان کے لئے آخرت میں ہونے والا ہے۔ صدام حسین کو جاننے والا وہ ہے جو صدام حسین کے واقعہ میں خود اپنے آپ کو جانے جو صدام حسین کے دنیوی انجام میں اپنے اخری انجام کو دیکھ لے۔

WOMAN BETWEEN ISLAM AND WESTERN SOCIETY

By Maulana Wahiduddin Khan

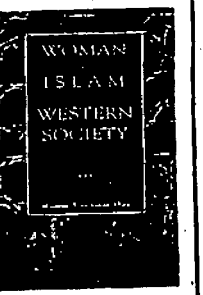

The status of woman in Islam is the same as that of man. Injunctions about honour and respect enjoined for one sex are enjoined equally for the other sex. So far as rights in this world and rewards in the Hereafter are concerned, there is no difference between the sexes. In the organization of daily living, both are equal participants and partners. Yet Islam sees man as man and woman as woman and, considering the natural differences, it advocates the principle of the division of labour between the two sexes rather than the equality of labour.

22 x 14.5 cm, 256 pages. ISBN 81-85063-75-3. Rs. 95

جھوٹ کی بنیاد پر

پراودا (Pravda) ایک روسی روزنامہ تھا۔ پراودا کے لفظی معنی سچ (truth) کے ہیں۔ روس کی کمیونسٹ پارٹی نے اشتراکی انقلاب (۱۹۱۷) سے کچھ پہلے ۱۹۱۲ میں اس کو ماسکو سے جاری کیا تھا۔ پراودا سابق سوویت روس کا سب سے زیادہ اہم اخبار سمجھا جاتا تھا۔ اس کا سرکلیشن گیارہ ملین کا پی روزانہ تھا۔ ابتدائی زمانہ میں اسٹالن اور لینن جیسے لوگ اس کے اڈیٹر رہ چکے تھے۔ اس کے نامہ نگاروں کی تعداد چالیس ہزار سے زیادہ تھی۔

پراودا کے پاس بڑی بڑی جائدادیں تھیں۔ حکومت کی طرف سے اس کو ہر قسم کی غیر معمولی امداد ملتی تھی۔ سوویت یونین کے سقوط (۱۹۹۱) کے بعد اچانک ساری امداد بند کر دی گئی۔ اگست ۱۹۹۱ میں اس کی جائدادوں کو ضبط کر لیا گیا۔ اس کے بعد اخبار ناقابل عبور مالی مشکلات میں مبتلا ہو گیا۔ یہاں تک کہ ۱۴ مارچ ۱۹۹۲ کو وہ بند کر دیا گیا۔

پراودا کی ساری اہمیت اشتراکی نظام کے ساتھ وابستہ تھی۔ اشتراکی لیڈروں نے سوویت یونین کے نام سے ایک معاشی اور سیاسی جہنم بنا رکھا تھا۔ مگر پراودا اس کو برعکس طور پر معاشی اور سیاسی جنت کے روپ میں پیش کرتا تھا۔ یہی پراودا کی قیمت تھی جب اشتراکی جھوٹ کا طلسم ٹوٹ گیا تو اس کے بعد پراودا کے لئے یہ موقع بھی ختم ہو گیا کہ وہ اس جھوٹ کو سچ بتائے۔ یہی سنگین حقیقت تھی جس نے پراودا کا خاتمہ کر دیا۔

ایک مبصر ٹائمس آف انڈیا ۱۹ مارچ ۱۹۹۲) نے سچائی کی موت (Truth is dead) کے زیر عنوان بجا طور پر لکھا تھا کہ اس پر تعجب نہیں کرنا چاہئے کہ اب وہ اس کو سخت مشکل پا رہا ہے کہ وہ اس سچائی کا سامنا کرے جو اشتراکی روس کے بعد کے دور میں کوئی مقام نہیں رکھتی:

No wonder, it now finds it difficult to face up to the truth that has no place in post-Communist Russia.

دنیا کا یہی معاملہ آخرت میں بھی پیش آئے گا۔ بہت سے لوگ جو آج بظاہر سچائی کے علمبردار بنے ہوئے ہیں، آخرت کا انقلاب آتے ہی ان کی حقیقت کھل جائے گی۔ اس کے بعد اچانک انھیں معلوم ہوگا کہ گیارہ ملین تو درکنار، گیارہ آدمی بھی ان کی نام نہاد سچائی کے خریدار نہیں ہیں۔

تخریبی منصوبہ ناکام

لاہور کے روزنامہ نوائے وقت (۲۴ جون ۱۹۹۴) میں ایک خبر چھپی ہے۔ اس کا عنوان ہے: ایک ٹیلیفون نمبر نے چار ڈاکوؤں کو پکڑوا دیا۔ اخبار کے مطابق واقعہ کی تفصیل یہ ہے:

سی آئی اے اسٹاف نے مسلم ٹاؤن (لاہور) میں ڈپٹی کمشنر انکم ٹیکس شاہین اصغر کے گھر ڈکیتی کرنے والے چار ڈاکوؤں کو ایک ٹیلیفون نمبر کے ذریعہ پکڑ لیا۔ پولیس افسر مسٹر احمد خان نے پریس کانفرنس میں بتایا کہ واقعہ کے روز مسلم ٹاؤن کے علاقہ میں چاروں ڈاکوؤں نے ڈپٹی کمشنر انکم ٹیکس اور ان کے ملازم کو رسیوں سے جکڑا اور ڈی سی کو اتنا مارا کہ ان کا جبڑا اور ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس دوران ایک ملزم کے کپڑے خون آلود ہو گئے تو اس نے اپنے کپڑے اتار کر شاہین اصغر کے کپڑے پہن لئے اور اپنے کپڑے موقعہ پر چھوڑ گیا۔ جب پولیس نے ان کپڑوں کی تلاشی لی تو اس کی جیب سے ایک ٹیلیفون نمبر نکلا جس کا پتہ ٹیلیفون ایکسچینج سے کروایا گیا تو وہ نمبر ملت پارک فلیٹ نمبر ۸ کا تھا جس کی پولیس نے نگرانی شروع کر دی۔ ایک روز معلوم ہوا کہ ڈاکو وہاں آئے ہیں۔ فلیٹ کے مالک فاروق احمد کا بھانجا علی عمران جو گلبرگ میں رہتا تھا وہ بھی اس واردات میں ملوث پایا گیا۔ ایس پی سی آئی اے نے بتایا کہ پولیس نے جب گلبرگ میں چھاپہ مار کر علی عمران کو پکڑا تو اس نے ڈپٹی کمشنر والے کپڑے پہن رکھے تھے۔ جب اس کی تلاشی لی گئی تو اس کی جیب سے ڈی سی کا ڈرائیونگ لائسنس بھی برآمد ہوا۔ پولیس نے اس کی نشاندہی پر مناواں میں بھٹی پولٹری فارم پر چھاپہ مار کر اس کے دوسرے ساتھیوں ناہید رفیق، مبشر ریاض اور محمد حسین کو بھی گرفتار کر لیا۔ ان سے دو گھڑیاں، نقدی اور بھاری مقدار میں اسلحہ برآمد ہوا۔ معلوم ہوا ہے کہ مبشر ریاض سابق پولیس اہلکار محمد ریاض کا بیٹا تھا۔ اور علی عمران ایک پولیس انسپکٹر کا سوتیلا لڑکا ہے۔

اس دنیا کا نظام کچھ اس طرح بنا ہے کہ کوئی تخریب کار خواہ کتنی ہی زیادہ ہوشیاری کرے اس کے منصوبے میں کہیں نہ کہیں ایسا خلا رہ جاتا ہے جس کو استعمال کر کے اس کے پورے منصوبہ کو ناکام بنا دیا جائے۔ تعمیری طاقت ہمیشہ تخریب سے زیادہ ہوتی ہے، اور یہی فرق تعمیر کی ابدی کامیابی کی یقینی ضمانت ہے۔

انھوں نے کہا کہ حیدر آباد میں تقسیم سے پہلے ایک بار ایسا ہوا کہ بہادر یار جنگ کے ایک عزیز کو ہندوؤں نے قتل کر دیا۔ اس کے بعد مسلمان تلوار لے کر نکل آئے۔ وہ ایک طرف سے ہندوؤں کو مارنا چاہتے تھے۔ مگر بہادر یار جنگ نے کہا کہ جس ہندو نے میرے عزیز کو قتل کیا ہے تم صرف اس کو مار سکتے ہو، سارے ہندوؤں کو نہیں مار سکتے۔ کیا آپ ہندوؤں میں ایسی کوئی ایک مثال بتا سکتے ہیں۔

میں نے کہا کہ آپ کو ایک نہیں، بہت سی مثالیں بتا سکتا ہوں۔ میرے خود اپنے وطن کا قصہ ہے۔ ایک مسلمان نے ایک ہندو (چھتر دھاری سنگھ) کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اس کے بعد سیکڑوں ہندو مقتول کے گھر پر جمع ہو گئے۔ انھوں نے چاہا کہ قاتل مسلمان کا تعلق جس گاؤں سے ہے اس گاؤں کے تمام مسلمانوں کو سخت سزا دیں۔ مگر مقتول کے بھائی نے زبردست مخالفت کی۔ اس نے ہندوؤں کی بھیڑ کو گاؤں میں داخل ہونے نہیں دیا۔ اس نے کہا کہ ہم دوسرے مسلمانوں کو نہیں ماریں گے اور نہ ہم قانون کو اپنے ہاتھ میں لیں گے۔ ہم قاتل مسلمان کو عدالت سے سزا دلوائیں گے۔ چنانچہ اس نے عدالتی کارروائی کی۔ چند سال تک مقدمہ جاری رہا۔ آخر کار عدالت سے قاتل کو لمبی مدت کی قید کی سزا ملی۔ ہندو مقتول کے بھائی نے روکا نہ ہوتا تو یقیناً بپھری ہوئی بھیڑ مسلمان قاتل کے گاؤں کو جلا دیتی۔ مقتول کے بھائی چتری سنگھ ابھی زندہ موجود ہیں۔

۲۷ دسمبر کو فجر کی نماز اسلامک سوسائٹی کی مسجد میں پڑھی۔ ایک عرب امامت کر رہے تھے۔ انھوں نے پہلی رکعت میں قرأت یہاں سے شروع کی: اِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ (النمل ۷۶) اس آیت پر غور کرتے ہوئے میری سمجھ میں آیا کہ ٹھیک یہی کام خود مسلمانوں میں بھی جاری رہتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ اللہ ہر سو سال میں ایک شخص اٹھاتا ہے جو دین کی تجدید کرتا ہے۔ یہ تجدید عین وہی چیز ہے جس کا مذکورہ آیت میں ذکر ہے۔ وقت گزرنے پر ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ مختلف معاملات میں دینی نقطۂ نظر کیا ہے، یہ گم ہو جاتا ہے۔ طرح طرح کے منحرف نقطۂ نظر رائج ہو جاتے ہیں۔ اس وقت اللہ کی توفیق سے ایک آدمی فہم و بصیرت والا اٹھتا ہے۔ وہ ہر معاملہ میں صحیح دینی نقطۂ نظر کا اعلان کرتا ہے۔ وہ تطہیر افکار کا کام انجام دیتا ہے۔ یہی کام بذریعہ قرآن اہل کتاب کے درمیان انجام پایا۔ اور یہی کام، ختم نبوت کے بعد، مجددین

کے ذریعہ امت محمدی میں جاری رہے گا۔

امام صاحب نے دوسری رکعت کے آخر میں لمبی قنوت نازلہ پڑھی۔ اس میں دو بار انھوں نے کہا: اللّٰھم دمّر دیار الکافرین۔ اسی قسم کے الفاظ انڈیا کی مسجدوں میں بھی سنائی دیتے ہیں۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ یہ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے مسلمانوں کی اس دعا کو قبول نہیں کیا۔ اگر فی الواقع یہ دعا قبول ہو جاتی اور کافروں کی تدمیر دیار کر دی جاتی تو خود دعا کرنے والوں کا بھی خاتمہ ہو جاتا۔ کیوں کہ یہ حضرات خود بھی انھیں کافروں کے درمیان رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دعا ہجرت کے بعد ہے نہ کہ ہجرت سے پہلے۔

دوسری بات یہ ہے کہ موجودہ حالات میں ہمارے لئے یہ دعا جائز ہی نہیں۔ اس وقت ہم دعوت کے مرحلہ میں ہیں نہ کہ برأت کے مرحلہ میں۔ دعوت کے مرحلہ میں صبر ہے نہ کہ بد دعا۔ داعی کو یک طرفہ طور پر مدعو کی زیادتیوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے، اس کے بغیر دعوت کے عمل کو انجام دینا ممکن نہیں۔

آرنج کاونٹی کے روزنامہ رجسٹر (۲۷ دسمبر ۱۹۹۳) کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا صفحہ ۴ جنگ (War) کی خبروں کے لئے تھا۔ اس صفحہ پر تین بڑے بڑے اشتہار تھے۔ صرف ایک خبر جنگ کی تھی اور وہ بوسنیا کے بارہ میں تھی۔ اس کی سرخی یہ تھی:

Muslim-led forces fight to win back lost territory.

دوسری خبر صفحہ ۸ پر اختلاف (Dispute) کے زیر عنوان تھی۔ یہ پیرس کے بارہ میں تھی۔ اس کا خلاصہ اس کی سرخی میں اس طرح تھا:

Muslim leader criticized schools' anti-scarf rules.

موجودہ زمانہ کے عالمی میڈیا میں مسلمان تشدد، اختلاف اور ٹکراؤ کا نشان بن گئے ہیں۔ مسلم دانشور اس کو غلط اطلاع (disinformation) کہتے ہیں۔ میں نے بہت غور کیا کہ یہ لوگ کیوں ایسا کہتے ہیں جب کہ بطور واقعہ ہر جگہ وہ یہی کر رہے ہیں۔ مسلم ملکوں میں نفاذ قانون کے نام پر، غیر مسلم ملکوں میں مداخلت فی الدین کے نام پر، اسی طرح کہیں جہاد حریت کے نام پر۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لیڈر چاہتے ہیں کہ وہ خواہ جو کچھ کریں ہر حال میں ان کو اسلام کا کریڈٹ

حاصل رہے۔ وہ دنیا کے لئے زحمت بنیں اس کے باوجود دنیا ان کو رحمت کا خطاب دے۔ مگر خدا کی دنیا میں کبھی ایسا ہونے والا نہیں۔ مسلمان کی تصویر ان کے اپنے اعمال کی بنیاد پر بنے گی نہ کہ ان کی خواہش کی بنیاد پر۔

کشمیر کے ڈاکٹر غلام نبی فائی بھی اس کانفرنس میں آئے تھے۔ ان کے خط کے جواب میں صدر کلنٹن کے خط (مورخہ ۲۷ دسمبر ۱۹۹۳) کا ہندستانی اخباروں میں کافی چرچا ہوا۔ انھوں نے اس خط کی ایک کاپی مجھے دی۔ امریکہ کے شعبہ خارجہ کے ایک افسر مسٹر ایو جین پرائس جونیر (Eugene D. Price Jr.) سے میں نے اس خط کی بابت پوچھا۔ انھوں نے کہا کہ انڈیا نے غیر ضروری طور پر اس خط کو اہمیت دے دی۔ اس طرح کا خط تو روٹین کے طور پر ہمارے یہاں سے روزانہ جاتا رہتا ہے۔ دفتر خارجہ کے کارکنوں کو ایک عام پالیسی بتا دی جاتی ہے۔ اس کے تحت وہ خود اس طرح کے خطوط کے جوابات دیتے رہتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ خود صدر کلنٹن ڈکٹیٹ کرا کے اس خط کو لکھوائیں۔ انھوں نے کہا کہ کشمیر کے بارہ میں ہماری پالیسی وہی ہے جو پہلے تھی۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

ایک کشمیری مسلمان نے کہا کہ فلپائن کا ایک کھلاڑی ٹینس کا ماہر تھا۔ وہ شاندار کھیل دکھا رہا تھا کہ اچانک فیلڈ کے اندر ہی گر پڑا اور فوراً مر گیا۔ انھوں نے کہا کہ میں نے اس واقعہ کو اخبار میں پڑھا تو میں نے کہا کہ آج مجھے یقین ہو گیا کہ کشمیر آزاد ہو کر رہے گا۔

یہ صاحب اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ وہ کشمیری تحریک میں ایک لیڈر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جو لوگ کشمیر کی پرتشدد تحریک چلا رہے ہیں وہ کتنے سادہ لوح لوگ ہیں۔

شکاگو کے الینوئی انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی (I.I.T.) میں انڈین طلبہ اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ لوگ مذاق سے اس کو انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی کہنے لگے ہیں۔ یہ بات عبد الحمید سیمجی نے بتائی۔ کھانے کی میز پر ایک صاحب نے کہا کہ یہودی مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ عبد الحمید سیمجی نے کہا کہ ہم لوگوں کا یہی ذہن ہماری ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ انھوں نے کہا کہ میری لڑکی نیو جرسی کے اسپتال میں ڈاکٹر ہے۔ وہاں ایک یہودی جونیئر ڈاکٹر میری بیٹی کو آنٹی کہتا ہے۔ جو کام وہ کہتی ہے فوراً بھاگ کر اس کو کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ ایک مسلم خاتون ہیں۔ مگر وہ

صرف اس لئے ایسا کرتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس طرح وہ اپنی تعلیمی ترقی جاری رکھ سکے گا۔ لوگوں کا اصل کنسرن ان کا اپنا انٹرسٹ ہے نہ کہ دوسروں کی دشمنی۔ عبد الحمید سیمی صاحب اس راز کو سمجھ گئے ہیں کہ اس دور میں ترقی کا راز تعلیم ہے۔ اپنے سب بچوں کو انھوں نے اعلیٰ تعلیم پر لگایا ہے۔

ایک بچہ جو یہاں کے ایک اسلامی اسکول میں پڑھتا ہے، اس سے میں نے کہا کہ کوئی آپ سے یہ پوچھے کہ اسلام کیا ہے (What is Islam) تو آپ کیا جواب دیں گے۔ بچہ کچھ جواب نہ دے سکا۔ پھر میں نے کہا کہ اچھا یہ بتائیے کہ اسلام کے ارکان (Pillars) کتنے ہیں۔ اس نے فوراً جواب دیا: پانچ، اور پھر شہادہ سے لے کر حج تک پانچ ارکان گنا دئے۔ میں نے سوچا کہ اس طرح کے اسلامی اسکولوں سے بچہ ایک رٹے ہوئے اسلام کو تو جان لے گا مگر وہ اس اسلام کو نہیں سیکھ سکتا جو اس کے ذہن کا جزء بن گیا ہو۔ وہ رٹی ہوئی باتوں کا جواب دہرائے گا۔ مگر اپنی سمجھ کو کام میں لاکر کوئی جواب دینا ہو تو وہ ایسا جواب دینے سے عاجز ثابت ہوگا۔

ایک صاحب کی تقریر یہاں کی ایک مسجد میں سنی۔ وہ انگریزی میں بول رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ کیوں ایسا ہے کہ ساری دنیا اسلام کی مخالف ہوگئی ہے:

Why is it that the whole of the world is against Islam.

اس کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج کی دنیا میں تمام لوگ سیکولر ہوگئے ہیں۔ حتی کہ مسلم ممالک بھی سیکولرزم کو اختیار کئے ہوئے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ سوال اور یہ جواب دونوں ہی غلط ہیں۔ نہ تو ایسا ہے کہ ساری دنیا اسلام کے خلاف ہوگئی ہے، اور نہ ایسا ہے کہ سیکولرزم اسلام کا دشمن ہے۔

بالفرض اگر دنیا اسلام کی مخالف ہوگئی ہو اور بالفرض سیکولرزم اسلام کے دشمن کے طور پر ظاہر ہوا ہو تب بھی اس قسم کی تقریر کرنا درست نہیں۔ ایسی حالت میں بھی مقرر کو یہ کہنا چاہئے کہ اسلام کی مخالفت اسلام کے نئے دور کی تمہید ہے۔ کیوں کہ جس نظریہ کی زیادہ مخالفت کی جائے وہ ہمیشہ ابھر کر رہتا ہے۔ ہمیں چاہئے کہ اسلام کی مخالفت کو اسلام کے چرچا کے معنی میں لیں اور اس کو اسلام کی دعوت کے لئے استعمال کریں۔

ایک مسلم ملک کے خطیب قائد امریکہ آئے۔ یہاں انھوں نے اردو داں مسلمانوں کے

سامنے ایک تقریر کی۔ یہ تقریر چھپی ہوئی مجھ کو ملی جس کو میں نے پڑھا۔ اس میں انھوں نے کہا تھا کہ "اسلامی تحریک، خواہ وہ امریکہ میں ہو یا اور کسی ملک میں، وہ کوئی تبلیغی تحریک نہیں، وہ اسلامی نظام قائم کرنے کی انقلابی مہم ہے۔ ہم اللہ کے دین کو ایک کامل سماجی سیاسی، سماجی، اقتصادی نظام (politico-socio-economic system) کی حیثیت سے قائم و نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ اس قیام و نفاذ کے لئے ہم مسلح ٹکراؤ تک جانے کے لئے تیار ہیں"۔ اسلام کی یہ تشریح سراسر بے بنیاد ہے۔ اسلامی تحریک اصلاً تبلیغی تحریک ہی ہے۔ امریکہ میں یہ اعلان لغویت کی حد تک بے معنی ہے کہ تم اپنے ملک میں اسلام کا سیاسی، سماجی، معاشی قانون نافذ کرو، ورنہ ہم تم سے مسلح جہاد شروع کر دیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکہ میں ہماری اصل ذمہ داری یہ ہے کہ ان کو ہم توحید اور آخرت کی حقیقت سے آگاہ کریں۔ اسلام کے اجتماعی قانون کا نفاذ نشانۂ دعوت نہیں ہے۔ وہ کسی خطۂ ارض میں مسلم معاشرہ بن جانے کے بعد اس معاشرہ کی ذمہ داری ہے۔

انڈو اسلامک فاؤنڈیشن آف امریکا (شکاگو) نے ۸۰ صفحہ کی ایک کتاب بابری مسجد کے موضوع پر ۱۹۹۳ میں چھاپی ہے۔ اس کے مؤلف ڈاکٹر عبد اللہ غازی ہیں۔ اس انگریزی کتاب کے آغاز میں اقبال کی اردو نظم "رام" ایک صفحہ پر نمایاں انداز میں چھاپی گئی ہے اور اگلے صفحہ پر اس کا انگریزی ترجمہ شائع کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں پہلی بار میں نے اقبال کی یہ پوری نظم دیکھی۔ وہ اس طرح تھی:

لبریز ہے شرابِ حقیقت سے جامِ ہند
سب فلسفی ہیں خطۂ مغرب کے رامِ ہند

یہ ہندیوں کے فکرِ فلک رس کا ہے اثر
رفعت میں آسماں سے بھی اونچا ہے بامِ ہند

اس دیس میں ہوئے ہیں ہزاروں ملک سرشت
مشہور جن کے دم سے ہے دنیا میں نامِ ہند

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند

اعجاز اس چراغِ ہدایت کا ہے یہی
روشن تر از سحر ہے زمانے میں شامِ ہند

تلوار کا دھنی تھا، شجاعت میں مرد تھا
پاکیزگی میں، جوشِ محبت میں فرد تھا

ایک پاکستانی مسلمان (مسٹر ریاض احمد۔ مقیم نیویارک) نے کہا کہ میں آپ کے الرسالہ کا قاری ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ آپ کی تحریریں دورِ حاضر کے لئے بے حد مفید ہیں۔ مگر ایک چیز مجھے

کھٹکتی ہے۔ وہ یہ کہ آپ کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ تقسیم ہند کے خلاف ہیں۔ مگر آپ کی یہ رائے درست نہیں۔ جب سے میں امریکہ آیا ہوں مجھے یقین ہو گیا کہ جناح صاحب نے پاکستان بنوا کر بہت اچھا کیا۔ کیوں کہ ہم مسلمانوں کا اپنا ایک دیش تو ہے جو ہماری قومی پہچان ہے۔

میں نے کہا کہ جب آپ اور آپ جیسے لاکھوں پاکستانی مسلمان علیحدہ دیش کو اتنا زیادہ ضروری سمجھتے ہیں تو اپنا الگ دیش بنوانے کے بعد وہ دوبارہ یورپ اور امریکہ میں آکر بے دیش کیوں ہو رہے ہیں۔ آپ لوگوں کا پاکستان چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں آباد ہونا خود آپ کے بیان کی تردید ہے۔ اگر پاکستان بننے کے بعد بھی آپ لوگوں کو غیر پاکستان میں رہنا تھا تو ایسی حالت میں پاکستان بنوانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ آپ لوگ علیحدہ ملک بنوانے کے بعد دوبارہ مشترک ملک میں رہ رہے ہیں۔ مزید یہ کہ اس تقسیمی سیاست نے مسلمانوں کو اتنا زیادہ نقصان پہنچایا ہے جس کی تلافی صدیوں میں بھی نہیں ہو سکتی۔

واشنگٹن کے سعودی سفارت خانہ کی طرف سے ایک عربی پمفلٹ تقسیم کیا گیا۔ اس میں شیخ عبد العزیز بن عبد اللہ بن باز کے کچھ فتاویٰ جمع کئے گئے تھے۔ ایک سوال و جواب یہ تھا:

س هل يجوز أن يُعطى الكافر نسخة من معاني القرآن الكريم علما انها تحتوي على القرآن الكريم كاملاً في الصفحة المقابلة۔

ج لا حرج في اعطاء الكافر نسخة من معاني القرآن الكريم لان الحكم للترجمة ولما في ذالك من البلاغ و الدعوة الى الاسلام۔

یعنی ایک کافر کو با ترجمہ قرآن دیا جا سکتا ہے۔ اس میں اگرچہ متن شامل ہے مگر وہ ترجمہ کے حکم میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں تبلیغ و دعوت کا فائدہ مضمر ہے۔ یہ بلاشبہ صحیح فتویٰ ہے۔ جو لوگ غیر مسلموں کو با ترجمہ قرآن دینے سے منع کرتے ہیں وہ دعوت و تبلیغ کے احساس سے خالی ہیں۔ وہ اسلام کی اسپرٹ کو سمجھنے سے محروم ہیں۔

ایک امریکی خاتون نے اسلام قبول کر لیا۔ اب وہ ایک پاکستانی مسلمان نصیر احمد مرزا سے نکاح کر کے اوٹا (Utah) میں رہتی ہیں۔ ان کا نام ہے اے مرزا (Jeanine Aisha Mirza) ہے۔ ان کا ایک انٹرویو میں نے پڑھا۔ اس کا ایک حصہ یہ تھا کہ اکثر امریکی یہ سمجھتے ہیں کہ مسلم بیویاں

زیادتی کا شکار ہوتی ہیں۔ مگر ان کے نزدیک یہ خیال درست نہیں۔ یہ تو محض ایک تقسیم ہے۔ گھر کے باہر میرا شوہر باس ہے۔ لیکن گھر کے اندر میں باس ہوں:

While most Americans are under the impression that Muslim wives are oppressed, Mirza said, she hasn't found that to be true. "It's just a different division. Outside the home, my husband's the boss. But in my house, I'm the boss."

اس طرح کے متعدد واقعات میرے علم میں آئے۔ امریکہ کی لڑکیاں سفید فام نسل کے لڑکوں سے شادی کرنے میں متردد رہتی ہیں۔ کیوں کہ انھیں ہر وقت طلاق کا ڈر لگا رہتا ہے۔ اس بنا پر اکثر سنجیدہ لڑکیاں مسلمان لڑکوں سے شادی کرنا پسند کرتی ہیں۔ یہ وہ لڑکے ہیں جو تعلیم وغیرہ کے مقصد سے امریکہ آتے ہیں۔ اس طرح کی شادیاں اسلام کی تبلیغ کا ذریعہ بن رہی ہیں۔ کیوں کہ اخبار کے لوگ ان امریکی لڑکیوں سے سوالات کرتے ہیں۔ اور وہ نہایت عمدہ انداز میں اسلام کی طرف سے دفاع کرتی ہیں۔ جس کی ایک مثال اوپر نقل ہوئی۔

امریکہ میں انڈیا کے "مظلوم مسلمانوں" کے نام پر بہت سی تنظیمیں قائم ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو انڈیا سے براہ راست یا براستہ پاکستان امریکہ گئے اور پھر وہاں کے شہروں میں آباد ہو گئے۔ اپنی معاشی سرگرمیوں کے ساتھ انھوں نے انڈین مسلمانوں کی ہمدردی میں مختلف ناموں سے ادارے قائم کر رکھے ہیں۔

اس قسم کے ایک مسلمان نے مجھے ۸۰ صفحہ کی ایک انگریزی کتاب دی۔ اس میں مختلف اخبارات سے انڈیا کے مسلمانوں کے بارہ میں خبروں اور رپورٹوں کو جمع کیا گیا تھا۔ اس کا نام تھا:

Oppression in India : A Case Study of Human Rights Violations

میں نے ان سے کہا کہ آپ لوگوں کو اگر انڈیا کے مسلمانوں سے واقعی ہمدردی ہے تو آپ ان کو چھوڑ کر یہاں کیوں چلے آئے۔ میں نے کہا کہ اس قسم کے مضامین اور کتابیں چھاپ کر آپ انڈیا کے مسلمانوں کی کوئی خدمت نہیں کر رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ انڈیا کے مسلمانوں کے جو مسائل ہیں اس کے ذمہ دار خود آپ جیسے مسلم دانش ور ہیں۔ آپ لوگ خود تو امریکہ میں آخری حد تک ایڈجسٹ کر کے رہتے ہیں اور ہندستانی مسلمانوں کو یہ سکھاتے ہیں کہ وہاں وہ ٹکراؤ کر کے رہنے کی کوشش کریں۔

امریکہ میں آپ لوگوں کو جو پیس حاصل ہے وہ ایڈجسٹمنٹ کی قیمت ہے، اور انڈیا کے مسلمانوں کو جو مسائل درپیش ہیں وہ ایڈجسٹمنٹ نہ کرنے کا نتیجہ ہیں۔

انھوں نے کچھ جواب دینے کی کوشش کی۔ مگر ان کے ایک ساتھی نے یہ کہہ کر انھیں چپ کر دیا کہ مولانا صاحب صحیح کہہ رہے ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ آپ لوگ انڈیا اور پاکستان میں گاڑی چلاتے ہیں تو بار بار ہارن بجاتے ہیں مگر آپ ہی لوگ جب امریکہ کی سڑکوں پر گاڑی چلاتے ہیں تو کبھی ہارن نہیں بجاتے۔ یہی تو وہ کہہ رہے ہیں۔ آپ کو اگر ہمت ہے تو یہاں اسی طرح ہارن بجا کر دیکھ لیجئے۔

۲۷ دسمبر کی شام کو میں صغیر اسلم صاحب کے دفتر میں تھا۔ انھوں نے ایک پیکٹ نکالا۔ اور اس کو مجھے دیتے ہوئے کہا کہ یہ کیلی فورنیا کی کھجور ہے۔ میں نے ایک کھجور ہاتھ میں لی۔ پھر میں نے صغیر اسلم صاحب سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں ایک بار بھوک کی حالت میں تھے۔ ایک انصاری آپ کو اور چند صحابہ کو اپنے ساتھ لے کر اپنے باغ میں گئے۔ وہاں وہ درخت سے کھجوروں کا ایک خوشہ توڑ کر لائے اور پانی پیش کیا۔ آپ نے کھجور کھا کر پانی پیا۔ پھر آپ نے فرمایا: یہ بھی ان نعمتوں میں سے ہے جس کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ تم سے سوال کیا جائے گا۔ (وَلَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ)

میں نے کہا کہ ایک صورت یہ ہے کہ آدمی کھجور کو بس امریکہ کی کھجور سمجھے۔ ایسی حالت میں اس نے اس کھجور کو صرف پیداوار امریکہ کے طور پر پایا، اس نے اسے تخلیق خداوندی کے طور پر نہیں پایا۔ گویا کہ وہ امریکی صنعت کو دیکھ سکا مگر وہ خدائی صنعت کو دیکھنے سے محروم رہا۔ ایسے ہی لوگوں کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ: من كان في هذه أعمى فهو في الآخرة أعمى (الاسراء ۷۲) خدا اس دنیا میں اپنی صفات کے ساتھ ظاہر ہوا ہے۔ آخرت میں وہ اپنی ذات کے ساتھ ظاہر ہوگا۔ جو آدمی صفات کی صورت میں خدا کو نہ دیکھ سکے وہ ذات کی صورت میں بھی خدا کو دیکھنے سے محروم رہے گا۔ اور بلاشبہ اس سے بڑی محرومی اور کوئی نہیں۔

میں نے کہا کہ میکسیکو کا ایک سیاح اسپین گیا۔ وہاں وہ قصر الحمراء دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں ایک اندھا فقیر وہاں آکر کھڑا ہو گیا۔ سیاح نے اپنی بیوی سے کہا کہ اس فقیر کو بہت زیادہ دے دو

THE WHITE HOUSE

WASHINGTON

December 27, 1993

Dr. Ghulam Nabi Fai
Executive Director
Kashmiri-American Council
Suite 1100
733 15th Street, N.W.
Washington, D.C. 20005

Dear Ghulam:

Thank you so much for your kind words about my recent speech to the United Nations General Assembly.

I share your belief that, in order to face the dilemmas of a post-Cold War global landscape, we all must look closely at our policies with regard to human rights. I am confident that we can bring about changes that are consistent with what the U.N. founders envisioned.

I look forward to working with you and others to help bring peace to Kashmir, and I appreciate your input.

Sincerely,

Bill Clinton

۲۷ الرسالہ مئی ۱۹۹۵

کیوں کہ کسی آدمی کی اس سے بڑی محرومی اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ وہ الحمرا کے سامنے اندھا ہو۔

بلاشبہ یہ محرومی بڑی عجیب ہے کہ آدمی الحمرا جیسے خوبصورت محل کے سامنے کھڑا ہو اور وہ اس کو دیکھنے کے لئے اندھا ہو۔ مگر اس سے بے شمار گنا زیادہ محرومی وہ ہوگی جب کہ خدا اپنے جمال وکمال کے ساتھ آخرت میں ظہور فرمائے گا مگر حال یہ ہوگا کہ بہت سے لوگ وہاں کھڑے ہوں گے مگر وہ اپنے اندھے پن کی وجہ سے اس کو دیکھنے کی سعادت نہیں پائیں گے۔

اسلامک سوسائٹی آف آرنج کاونٹی کے ریڈنگ روم میں مختلف زبانوں کے کئی پرچے دیکھے ریاض کے عربی ہفت روزہ المسلمون (۲۴ دسمبر ۱۹۹۳) کے آخری صفحہ پر ایک خبر تھی جس کا عنوان تھا: الآلاف دخلوا الاسلام (ہزاروں آدمی اسلام میں داخل ہو گئے) دکتور صلاح الصاوی (استاذ جامعۃ الازہر) کے حوالے سے ایک رپورٹ تھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ امریکی فوجیوں کی پانچ ہزار تعداد اسلام میں داخل ہو گئی۔ یہ خلیج کے بحران کے دوران اس وقت ہوا جبکہ امریکی فوجیوں اور سعودی نوجوانوں کے درمیان اختلاط ہوا:

ان اعداداً أكبر تقيل انما ۵۰۰۰ جندى امريكى قد دخلوا الاسلام حينما اتيح لهم الاختلاط بالشباب السعودى.

ایک صاحب نے کہا کہ ہندستانی مسلمانوں کے مسائل کے بارہ میں مجھے بہت زیادہ تشویش ہے۔ وہ مظلوم ہیں۔ وہ نصف صدی سے زیادتی کا شکار ہورہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہندستان جاکر ان کی خدمت کروں۔ میں نے کہا کہ اگر آپ وہاں جاکر انھیں یہی سبق دینا چاہتے ہیں کہ تم مظلوم ہو تو آپ خود ان کے اوپر سب سے بڑا ظلم کریں گے۔ کیوں کہ کسی قوم کو مظلوم ومقہور بتانا، اور اس کو شکست کے احساس میں مبتلا کرنا گویا نفسیاتی اعتبار سے اس کو قتل کرنا ہے۔ کسی قوم کو آپ احساس یافت پر کھڑا کر سکتے ہیں، احساس محرومی پر کسی قوم کو کھڑا کرنا ممکن نہیں۔

انھوں نے مزید کہا کہ مسلم ممالک ہندستان میں اپنے مسلم بھائیوں کا کوئی خیال نہیں کرتے جیسا کہ انھیں کرنا چاہئے:

Muslim countries do not care about their Indian Muslim brothers as they should.

میں نے کہا کہ اس سے آپ کا مطلب اگر یہ ہے کہ مسلم ممالک ہمارے بارہ میں بیانات دیں اور حکومت ہند سے مطالبات کریں تو ایسا کرنا ہرگز ہندستانی مسلمانوں کی کوئی خدمت نہیں ہوگی۔ بلکہ اس کا الٹا نتیجہ برآمد ہوگا اور ہمارے مسائل مزید پیچیدہ ہو جائیں گے۔ ہندستانی مسلمانوں کے مسائل خود ہندستانی مسلمانوں کو دانش مندی کے ساتھ حل کرنا ہے۔ باہر سے اس کا کوئی حل امپورٹ نہیں کیا جا سکتا۔

جناب صفی قریشی صاحب نے بتایا کہ ۱۹۸۳ میں جب کہ رونالڈ ریگن امریکہ کے پریسیڈنٹ تھے۔ مسٹر کرین (Robert Crane) کو عرب امارات کا سفیر بنایا گیا۔ ان کے کاغذات جب مخصوص کمیٹی کے سامنے پیش ہوئے تو اس نے دیکھا کہ مذہب کے خانہ میں ان کے فارم میں اسلام لکھا ہوا ہے۔ انھوں نے دراصل کچھ پہلے اسلام قبول کر لیا تھا اور ان کا اسلامی نام فاروق عبد الحق تھا۔ کمیٹی کے ارکان کو اس پر اعتراض ہوا۔ اس وقت کمیٹی کے ایک سینئر ممبر مسٹر ریمزے کلارک (Ramsey Clarke) نے اس تقرر کی حمایت کرتے ہوئے کہا کہ اب وقت آگیا ہے کہ امریکہ مسلم ملک میں ایک مسلم سفیر بھیجے:

It is time that America should send a Muslim Ambassador to a Muslim country.

ڈاکٹر سلمان ندوی (پیدائش ۱۹۳۳) مولانا سید سلیمان ندوی کے صاحبزادے ہیں۔ تقسیم کے بعد وہ اپنے والد کے ساتھ کراچی چلے گئے۔ انھوں نے بتایا کہ ایک بار انھوں نے مولانا سید سلیمان ندوی سے پوچھا کہ آپ کانگرسی ہیں یا مسلم لیگی۔ سید صاحب نے جواب دیا: دماغ سے کانگرسی ہوں مگر دل سے مسلم لیگی ہوں۔ ان کا اشارہ اس طرف تھا کہ ان کے علمی استاد مولانا شبلی نعمانی کا تعلق کانگرس سے تھا، اور ان کے مرشد مولانا اشرف علی تھانوی کا جھکاؤ مسلم لیگ کی طرف تھا۔ اس لئے دل مسلم لیگ کی طرف مائل ہے۔

میرے نزدیک یہ اکابر پرستی ہے۔ اسی اکابر پرستی نے موجودہ زمانہ میں مجتہدانہ طرز فکر کا دروازہ مسلمانوں کے اوپر بند کر دیا۔

ڈاکٹر سلمان ندوی نے بتایا کہ ۱۹۰۶ میں ندوہ (لکھنو) کا دستار بندی کا جلسہ تھا۔ اسی

سال مولانا سید سلیمان ندوی وہاں کی تعلیم سے فارغ ہوئے تھے۔ حاضرین میں بڑے بڑے لوگ موجود تھے۔ غلام السیدین صاحب نے عین جلسہ میں مولانا شبلی نعمانی سے کہا کہ اگر ندوہ کا کوئی طالب برجستہ عربی میں تقریر کرے تو میں ندوہ کی اہمیت کو مانوں گا، ورنہ نہیں۔

مولانا شبلی نے سید صاحب کو بلایا اور ان کے کان میں پوچھا کہ تم عربی میں تقریر کر سکتے ہو۔ سید صاحب نے کہا کہ ہاں۔ اس کے بعد مولانا شبلی نے غلام السیدین سے کہا کہ یہ طالب علم عربی میں تقریر کرنے کے لئے تیار ہے، آپ عنوان بتائیں۔ انھوں نے یہ عنوان دیا کہ ہندستان میں اسلام کی اشاعت کس طرح کی جائے۔ اب سید صاحب کا نام پکارا گیا۔ وہ اسٹیج پر آئے اور برجستہ تقریر کرنا شروع کیا۔ تاہم مولانا شبلی بے چین تھے کہ اگر کہیں یہ صاحب تقریر نہ کر سکے تو ندوہ کی سخت بے عزتی ہوگی۔ اس بے چینی میں وہ ہال کے باہر چلے گئے۔ اور گھبراہٹ کے عالم میں باہر ٹہلتے رہے۔

کچھ دیر کے بعد ہال کے اندر احسنت، مرحبا کا شور بلند ہوا۔ اب مولانا شبلی اندر آئے۔ سید صاحب کی اس کامیابی پر وہ اتنا خوش ہوئے کہ خود اپنا عمامہ اپنے سر سے اتار کر سید صاحب کے سر پر رکھ دیا۔

اسلام کے بارہ میں یہاں میں نے جو کتاب یا مقالہ دیکھا۔ تقریباً سب میں ایک بات مشترک تھی۔ سب میں یہ نظریہ موجود تھا کہ اسلام میں مذہب اور سیاست کی تفریق نہیں۔ مثلاً مسٹر غلام سرور کی کتاب دیکھی اس کا نام تھا:

Islam : beliefs and teachings (1987)

اس کا دسواں باب پولیٹیکل سسٹم آف اسلام ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے ـــــ مذہب اور سیاست اسلام میں بالکل ایک ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں:

Religion and politics are one and the same in Islam. They are intertwined. (p. 177)

اسی طرح ڈاکٹر احمد اپنے صغر کا مقالہ آور ٹائم (یکم ستمبر ۱۹۹۳) میں پڑھا۔ یہ میگزین کیلی فورنیا سے چھپتا ہے۔ انھوں نے لکھا تھا کہ اسلام مغربی مذاہب کی طرح ایک مذہب نہیں ہے۔ وہ ایک مکمل نظام زندگی ہے۔ اس میں مذہب اور اسٹیٹ کا فرق نہیں:

Islam is not a religion as is the case with western religions. It is a total way of life, and has complete systems for mankind. This means that there is no separation between state and religion. (p. 41)

اس موضوع پر ایک صاحب سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے دانش ور اس طرح لکھتے ہیں گویا کہ اسلام اور دوسرے مذاہب میں جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ دوسرے مذاہب ناقص نظام ہیں اور اسلام کامل نظام۔ یہ ایک غیر علمی بات ہے۔ دونوں میں اصل فرق یہ ہے کہ اسلام محفوظ مذہب ہے اور دوسرے مذاہب محرف اور غیر محفوظ۔

ایک تعلیم یافتہ مسلمان سے بات ہو رہی تھی۔ میں نے کہا کہ یہاں کے مسلمانوں کے بارہ میں جو معلومات مجھے ہوئی ہے اس سے میں نے پایا کہ یہاں کا جو دینی طبقہ ہے وہ زیادہ تر تشخص (آئیڈنٹٹی) کی بات کرتا ہے۔ میں نے کہا کہ اگر آپ یہاں کے ہندوؤں سے بات کریں تو وہ بھی تشخص ہی کے مسئلہ میں الجھے ہوئے نظر آئیں گے۔ اس پر غور کرتے ہوئے میں نے سمجھا کہ یہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک قومی ظاہرہ ہے نہ کہ فی الواقع کوئی دینی ظاہرہ۔ تشخص اصلاً ظاہری ہیئت سے تعلق رکھنے والی چیز ہے۔ دینی اعتبار سے ہمارا اصل کنسرن تشخص نہیں ہونا چاہئے بلکہ کردار ہونا چاہئے۔

انھوں نے میری بات سن کر کہا ـــــ آپ موحد قوم کا تقابل مشرک قوم سے کر رہے ہیں۔ یہ کتنا غلط تقابل ہے۔ وغیرہ

میں اکثر سوچتا ہوں کہ موجودہ زمانہ کا سب سے بڑا فقہ اہلِ علم (intellectuals) ہیں۔ ان کے پاس خوبصورت الفاظ کا وافر ذخیرہ ہوتا ہے اور وہ فیاضانہ طور پر ان کا استعمال کرتے ہیں۔ آپ ایک کارآمد بات کہیں گے اور وہ ایک خوبصورت لفظی مجموعہ بول کر اس کو رد کر دیں گے۔ آپ مینیم کی بات کریں گے اور وہ میکسیمم پر تقریر کرنا شروع کر دیں گے۔ آپ نقطۂ آغاز کی بات کریں گے اور وہ نقطۂ اختتام کا مسئلہ چھیڑ دیں گے۔ آپ عملی حل پیش کریں گے اور وہ اس کے مقابلہ میں معیاری حل لاکر بحث شروع کر دیں گے۔ آپ کسی لفظ کو ایک خاص معنی میں استعمال کریں گے اور وہ اس لفظ کو دوسرے معنی میں استعمال کرکے اس کو بے قیمت ثابت کر دیں گے۔ آپ ایک سنجیدہ نقطۂ نظر پیش کریں گے اور وہ ایک لطیفہ چھیڑ کر اس کو مذاق میں اڑا دیں گے۔

۲۷ دسمبر کو نماز عشاء کے بعد اسلامک سوسائٹی کی مسجد میں خطاب تھا۔ میں نے کہا کہ امریکہ میں اور دوسرے مغربی ملکوں میں جو مسلمان آباد ہیں ان سے گفتگو کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ان کا سب سے بڑا کنسرن آئیڈنٹٹی ہے۔ مگر آئیڈنٹٹی پر زور دینے سے آئیڈنٹٹی قائم نہیں ہو سکتی۔ آدمی کا نیچر یہ ہے کہ وہ اسی چیز کو لیتا ہے جو اس کو برتر دکھائی دے۔ اس لئے آپ کو یہ کرنا ہوگا کہ اسلام کی آئیڈیالوجیکل سپیریریٹی کو نئی نسلوں کے دماغ میں اتاریں۔

اس مقصد کے لئے آپ کو اعلیٰ اسلامی لٹریچر کی ضرورت ہے۔ مگر یہ لٹریچر انگریزی میں موجود نہیں۔ لٹریچر اس طرح نہیں بنتا کہ کسی کو ہائر کر کے آپ کہیں کہ تم "واٹ از اسلام" کے نام سے ایک کتاب لکھ دو۔ لٹریچر ہمیشہ ہسٹاریکل پراسس کے دوران بنتا ہے۔ یہ تاریخی عمل انگریزی زبان میں جاری ہو چکا ہے۔ اسی طرح اردو زبان میں بھی کئی سو سال کے عمل کے دوران کافی لٹریچر تیار ہو چکا ہے۔ اس لئے کم از کم فی الحال آپ کو یا عربی یا اردو زبان میں اپنے بچوں کو سکھانا ہوگا۔ سنجیدہ کوشش اور قربانی کے بغیر یہ کام نہیں ہو سکتا۔

۲۸ دسمبر کو نماز عشاء کے بعد دوبارہ اسلامک سوسائٹی کی مسجد میں خطاب ہوا۔ میں نے بعض احادیث کی روشنی میں دینی تقاضوں کی وضاحت کی۔ امریکہ میں قیام کے دوران ہر روز صغیر اسلم صاحب کے مکان پر احادیث مع تشریح ریکارڈ کراتا رہا۔ اس کا انتظام صغیر اسلم صاحب نے کیا تھا۔

برصغیر ہند سے امریکہ جانے والے لوگوں نے وہاں بہت سی چھوٹی بڑی تنظیمیں قائم کر رکھی ہیں۔ انہیں میں سے ایک تنظیم وہ ہے جو امریکن فیڈریشن کہی جاتی ہے:

American Federation of Muslims from India,
29008-W, 8 Mile Road, Farmington, Michigan 48336

اس فیڈریشن کی طرف سے ۲۹۔ ۳۰ اکتوبر ۱۹۹۳ کو شکاگو میں "تھرڈ انٹرنیشنل کانفرنس" ہوئی۔ اس میں امریکہ کے علاوہ ہندستان سے کئی ہریجن اور مسلمان مقررین شریک ہوئے۔ اس کانفرنس کی تھیم یہ تھی:

The Role of Muslims in the socio-economic development of India

کانفرنس کا موضوع بظاہر یہ تھا کہ انڈیا کی سماجی اور اقتصادی ترقی میں مسلمانوں کا رول۔ مگر وہاں جو تقریریں ہوئیں، اس کے لحاظ سے اس کا موضوع ہونا چاہئے تھا ـــــ ہندستان کی سماجی اور اقتصادی ترقی میں مسلمانوں کے لئے حصہ داری کی مانگ۔ تقریروں اور رزولیوشن کا خلاصہ یہ تھا کہ "ہندو نازی ازم" ختم کرو۔ مسلمانوں کو ملازمت میں اور تعلیمی داخلہ میں ریزرویشن دو۔ ایڈمنسٹریشن میں مسلمانوں کو ان کی تعداد کے بقدر حصہ دو۔ دلت مقررین نے کہا کہ بھارت میں برہمن واد کو ختم کرنے کے لئے دلت اور مسلمانوں کو ایک ہونا چاہئے۔" وغیرہ

میرے نزدیک اس قسم کی باتیں صرف نادانی کی چیخ پکار ہیں۔ یہ ایک برائی کے جواب میں دوسری برائی کا طوفان کھڑا کرنا ہے۔ کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ تفویقی دہشت گردی کو ختم کرکے ملکی سطح پر ایکتا لانے کی کوشش کی جائے۔ رعایت اور ریزرویشن کے بجائے محنت اور لیاقت کے ذریعہ آگے بڑھنے کا مزاج بنایا جائے۔ ردعمل والی سوچ کو ختم کرکے مثبت اور تعمیری سوچ پیدا کی جائے۔ عجیب بات ہے کہ جو لوگ امریکہ جاکر وہاں کے نظام سے آخری حد تک موافقت کرکے رہتے ہیں، وہ وہاں سے ہندستانی مسلمانوں کے لئے ٹکراؤ کی پالیسی برآمد کر رہے ہیں۔ اس دوعملی میں بیشتر امریکی مسلمان مبتلا ہیں۔ اس قسم کی دوعملی کی روش سلمی لیڈری ہے نہ کہ فی الواقع کوئی رہنمائی۔

ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوۃ (۸ نومبر ۱۹۹۳) میں ایک مضمون شائع ہوا تھا، جس کا عنوان تھا: عندھم کل شئ إلا ... اس میں بتایا گیا تھا کہ امریکہ میں ہر چیز پائی جاتی ہے سوا خیر کے (فی امریکا یوجد کل شئ إلا الخیر) اور پھر حدیث رسول کو امریکہ پر چسپاں کیا گیا تھا: انا بریٔ من مسلم یقیم بین ظھرانی المشرکین۔

مگر یہ دین کی صحیح تشریح نہیں۔ امریکہ میں بلاشبہ ایک بہت بڑا خیر ہے، اور وہ وہی چیز ہے جس کو حدیث میں سرخ اونٹ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی دعوت اسلام کا کام کرنا اور خدا کے ان بندوں کو خدا کی رحمت کے سایہ میں داخل کرنا۔

مجھ کو اپنے سفر کے دوران کچھ سفید فام امریکنوں سے بات کرنے کا موقع ملا۔ ذاتی تجربہ کی بنا پر میرا خیال ہے کہ عام امریکی میں قبولیت کا مادہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ کسی معقول بات کو

ان کا ذہن فوراً جان لیتا ہے۔ سفید فام امریکنوں کے مزاج کے بارہ میں اپنے اس تاثر کا ذکر میں نے جناب صغیر اسلم صاحب سے کیا جو یہاں ۳۵ سال سے رہتے ہیں، انھوں نے میرے احساس کی تصدیق کی۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ میں برابر لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں۔ امریکی روزنامہ وال اسٹریٹ جرنل (۵ اکتوبر ۱۹۹۰) کی رپورٹ کے مطابق، ماہرین مذہب کا خیال ہے کہ اسلام امریکہ میں سب سے زیادہ تیزی سے بڑھنے والا مذہب ہے:

Many religious experts say Islam is the fastest-growing faith in the United States.

ایسی حالت میں کہنے والوں کو کہنا چاہئے کہ امریکہ میں بہت بڑا خیر موجود ہے۔ وہاں کے لوگوں تک اسلام کی دعوت پہنچاؤ اور پھر سرخ اونٹوں کی دولت حاصل کرو۔

ایک ہندستانی مسلمان جو اب امریکہ میں رہتے ہیں، انھوں نے شکایت کی کہ ہندستان میں مسلمانوں کے ساتھ تعصب برتا جا رہا ہے۔ میں نے کہا کہ اس کے ذمہ دار آپ جیسے لوگ ہیں۔ آپ لوگ خود تو امریکہ میں یک جہتی کی پالیسی اختیار کئے ہوئے ہیں اور ہندستان کے معاملہ میں وہاں کے استحصالی لیڈروں کی مدد کرتے ہیں جو مسلمانوں کو علیحدگی پسندی کے راستہ پر چلانا چاہتے ہیں۔

پھر میں نے ان کو مقامی اخبار آرنج کاونٹی (Orange County) کا شمارہ ۹ نومبر ۱۹۹۳ دکھایا۔ اس میں ایک مسلم لیڈر شبیر منصوری کا ایک انٹرویو چھپا ہوا تھا۔ اس میں انھوں نے کہا تھا کہ مجھے امریکی مسلمان ہونے پر فخر ہے:

I am proud to be a Muslim-American.

میں نے کہا کہ ہندستان کے لیڈر، خواہ باریش ہوں یا بے ریش، کبھی یہ نہیں کہتے کہ مجھے ہندستانی مسلمان ہونے پر فخر ہے۔ ایسی حالت میں اگر اکثریتی فرقہ اور مسلمانوں کے درمیان معتدل تعلقات نہ پائے جائیں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ میں نے کہا کہ آپ لوگ ڈبل اسٹینڈرڈ ہیں۔ آپ لوگ ہندستانی مسلمانوں کے لئے کچھ پسند کرتے ہیں اور خود اپنے لئے کچھ اور پسند کئے ہوئے ہیں۔

جیسا کہ مشہور ہے، کرسٹوفر کولمبس نے امریکہ کو دریافت کیا تھا۔ وہ ۱۲ اکتوبر ۱۴۹۲ کو امریکہ کے ساحل پر پہنچا تھا۔ اس دن اس نے اپنی ڈائری کا جو صفحہ لکھا، اس میں اس نے ۱۳۹ بار سونا کا لفظ استعمال کیا۔ اس وقت کولمبس کی نظر میں سب سے زیادہ اہمیت سونے کی تھی۔ کولمبس کو معلوم نہ تھا کہ چند سو سال بعد امریکہ ایک ایسے فن کا مرکز بننے والا ہے جو سونے سے بھی زیادہ قیمتی ہے اور وہ جدید ٹکنالوجی ہے۔

دہلی سے ایک انگریزی ہفت روزہ آرگنائزر شائع ہوتا ہے۔ یہ ریڈئنس کا ہندو مثنیٰ ہے۔ میں نے ایک صاحب سے کہا کہ آرگنائزر ہندوؤں کا ریڈئنس ہے، اور ریڈئنس مسلمانوں کا آرگنائزر۔ دونوں ہی منفی اصولِ صحافت پر چلائے جا رہے ہیں۔

آرگنائزر کے شمارہ ۵ دسمبر ۱۹۹۳ میں ایک مضمون اتل رادت کے قلم سے چھپا تھا۔ اس کا عنوان تھا ــــــ اجودھیا امریکی پریس میں:

Ayodhya in American Press

امریکی اخباروں میں اجودھیا کے واقعات پر جو کچھ چھپا تھا اس میں انھیں برا بھلا کہتے ہوئے مضمون میں بتایا گیا تھا کہ انڈیا کی خبریں اور خاص طور پر ہندوؤں کی خبریں امریکی پریس میں ہمیشہ غلط طور پر یا غلط رخ سے پیش کی جاتی ہیں:

The news dealing with India in general and Hindus in particular is, more often than not, misrepresented and misinterpreted in American press.

مضمون نگار کو مثلاً یہ شکایت تھی کہ نیویارک ٹائمس نے اپنے شمارہ ۷ دسمبر ۱۹۹۲ میں اجودھیا کے واقعہ کی رپورٹ دیتے ہوئے یہ لکھا کہ ہزاروں ہندو انتہا پسندوں نے اجودھیا میں گھس کر ۱۶ ویں صدی کی تعمیر شدہ مسجد کو ڈھا دیا۔ نیویارک ٹائمس اجودھیا کے متنازعہ ڈھانچہ کو برابر مسجد بتاتا رہا:

Consistently the New York Times had been describing the disputed structure as mosque.

ٹھیک یہی ذہن مزید اضافہ کے ساتھ موجودہ زمانہ کے نام نہاد مسلم دانشوروں میں ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ وہ نفرت کی باتیں کریں مگر دنیا اس کو محبت کا عنوان دے۔ وہ تشدد کی کارروائی

کریں مگر دنیا اس کو امن کا اقدام بتائے۔ وہ لوگوں کے راستے میں کانٹے بکھیریں مگر دنیا یہ اعلان کرے کہ انھوں نے ہمارے راستہ کو پھولوں سے بھر دیا ہے۔ اور جب دنیا ایسا نہیں کرتی تو وہ پرجوش طور پر اعلان کرتے ہیں کہ ساری دنیا کا میڈیا مسلم دشمن ہے، وہ گہری سازش کے تحت مسلمانوں کے بارہ میں غلط خبر رسانی (disinformation) کا فعل انجام دے رہا ہے۔

آرنج کاونٹی کی اسلامک سوسائٹی کی مسجد ایک متروکہ چرچ کو خرید کر بنائی گئی ہے۔ اس قسم کے واقعات امریکہ اور یورپ میں عام ہیں۔ متروکہ چرچ کی عمارت کو کہیں مسلمانوں نے خرید کر مسجد بنالی ہے اور کہیں ہندوؤں نے خرید کر اس کو مندر میں تبدیل کرلیا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ مسیحی تصور کے مطابق، چرچ کسی مقام یا عمارت کا نام نہیں ہے۔ چرچ، قدیم لفظ اکلیسیا (ekklesia) کی جگہ استعمال ہوتا ہے۔ قدیم یونان میں اکلیسیا اجتماع (اسمبلی) کے معنی میں بولا جاتا تھا۔ اس کے بعد مسیحیوں نے اس کو مذہبی اجتماع کے معنی میں بولنا شروع کیا۔ اب اکلیسیا یا چرچ ہم معنی طور پر مذہبی اجتماع یا مذہبی ایسوسی ایشن کے مفہوم میں بولا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کسی مقام پر مسیحیوں کے نہ ہونے کی وجہ سے چرچ کی بلڈنگ کا مذہبی استعمال باقی نہ رہے تو تو اس کی مذہبی حیثیت بھی ختم ہوجاتی ہے۔ اور پھر اس کو بیچنا ایسا ہی بن جاتا ہے جیسے کسی خالی گھر کو بیچ دینا۔ تاہم مسیحی حضرات اس کو پسند کرتے ہیں کہ ایک مذہبی عمارت دوبارہ مذہبی عمارت ہی کی حیثیت سے باقی رہے۔ اسی لئے اس قسم کے چرچ نہایت آسانی سے مسجد یا مندر والوں کو حاصل ہوجاتے ہیں۔

لاس اینجلس کے مسٹر عبد الحکیم نے اپنا ایک پیپر (Muslims of India) پڑھنے کو دیا۔ اس کا عنوان یہ تھا کہ ہوشیار دشمن بیوقوف دوست سے اچھا ہے۔ اس کی تشریح میں نیچے لکھا ہوا تھا کہ ہندستان کی مسلم لیڈرشپ بھی جزئی طور پر ذمہ دار ہے:

A smart enemy is better than a foolish friend (Muslim leadership is also partly responsible)

میں نے کہا کہ جزئی طور پر نہیں بلکہ کلی طور پر مسلمانوں کی نااہل لیڈرشپ ہی ان کے تمام مسائل کی ذمہ دار ہے۔ مثلاً ڈزرویشن کے دور میں اس نے مسلمانوں کے اندر رزرویشن کا ذہن بنایا

موجودہ زمانہ میں صحافت ایک انڈسٹری ہے۔ اس کو جو لوگ چلاتے ہیں وہ اظہار حق کے لئے
ں کو نہیں چلاتے بلکہ خالص تجارتی مصلحت کے تحت چلاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اخبارات ہمیشہ گرما گرم
بروں کو اہمیت دیتے ہیں۔ کیوں کہ عوام ایسی خبروں کو پڑھنے میں خاص دلچسپی لیتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ان اخبارات میں زیادہ تر انتہا پسند مسلمانوں کی باتیں نمایاں کی جاتی ہیں۔
لاً کچھ مسلمانوں نے جب امریکہ کے ٹریڈ سنٹر پر بم مارا تو یہ خبر فوراً تمام اخباروں میں چھپ گئی۔
ب کہ دوسری اچھی خبریں ان اخباروں کے صفحات میں بہت کم جگہ پاتی ہیں۔ اس بنا پر ایسا
ہے کہ جو امریکی اخبار کی خبروں سے اسلام کے بارہ میں واقف ہوتے ہیں وہ اسلام کو ایک
ہشت گرد مذہب سمجھتے ہیں، کیوں کہ اسلام کی نسبت سے وہ ہمیشہ اسی قسم کی خبریں اپنے اخباروں
یں دیکھتے ہیں۔

اس مسئلہ کا حل یہ نہیں ہے کہ ہم امریکی صحافت کی مذمت کریں۔ اس کا حل صرف یہ ہے کہ
ن مسلمانوں کی حوصلہ شکنی کی جائے جو منفی طرز فکر میں مبتلا ہیں اور تشدد انہ قسم کے واقعات برپا
رکے اہل صحافت کو یہ موقع دیتے ہیں کہ وہ اسلام کی تصویر کو خراب کریں۔

ایک جائزہ کے مطابق، ۴۰ فیصد امریکی اسلام کے بارہ میں کچھ نہیں جانتے۔ ۳۰ فیصد کا یہ کہنا ہے کہ وہ
اسلام کے ساتھ موافقت کر کے رہ سکتے ہیں۔ ۳۰ فیصد امریکیوں نے واضح طور پر اسلام سے اپنی بیزاری کا اظہار کیا۔

Omar ibn Khattab Mosque, in Los Angeles, America.

لاہور کے اردو روزنامہ نوائے وقت (۱۰ جنوری ۱۹۹۴) میں ایک رپورٹ نظر سے گزری یہ ایک پاکستانی نژاد مقیم امریکہ ڈاکٹر مقبول راشد کا انٹرویو تھا جو انھوں نے نوائے وقت کے نمائندہ کو دیا تھا۔ انھوں نے جو باتیں کہیں ان میں سے ایک بات یہ تھی کہ "امریکہ میں نقل مکانی کرنے والے غیر سفید فام باشندوں میں بھارتی نژاد ہندو سب سے زیادہ طاقت ور اور دولت مند ہیں۔ بھارتی افراد میں اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی شرح سب سے زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ بھارتی نژاد شہری امریکہ میں کلیدی سرکاری عہدوں پر بھی کام کر رہے ہیں۔ امریکی معیشت کا بھی بہت بڑا حصہ بھارتی نژاد باشندوں کے ہاتھ میں ہے۔ امریکہ میں یہ بھارتی باشندے تعداد، وسائل اور اثر و رسوخ میں پاکستانی مسلمانوں سے بہت آگے ہیں۔" صفحہ ۳

یہ بات بالکل درست ہے۔ میں نے خود بھی اپنے سفر امریکہ کے دوران اس فرق کا مشاہدہ کیا۔ اب اگر پاکستانی مسلمانوں کے ساتھ ہندستانی مسلمانوں کو ملا لیا جائے تو امریکہ میں مسلمانوں کی تعداد اور ہندوؤں کی تعداد برابر ہے۔ ہر ایک کی تعداد پانچ اور چھ لاکھ کے درمیان ہے دوسری طرف خود نوائے وقت کے شمارہ ۱۷ جنوری ۱۹۹۴ میں ایک پاکستانی نژاد امریکی خاتون سائرہ چودھری کا انٹرویو اس کے مخصوص کالم مہمان شہر (گیسٹ ان ٹاؤن) میں چھپا ہے۔ موصوفہ نے زور دے کر بتایا کہ امریکہ میں کسی قسم کا تعصب یا طرفداری نہیں۔ وہاں ہر شخص کو یکساں طور پر ترقی کے مواقع حاصل ہیں (صفحہ ۳)

مسٹر محمد علی جناح تقسیم کی تائید میں کہتے تھے کہ غیر منقسم ہندستان میں ہندوؤں کا تعصب مستقل طور پر مسلمانوں کی ترقی میں رکاوٹ بنا رہے گا۔ اب موجودہ انڈیا میں نام نہاد مسلم لیڈروں کے بیان کے مطابق دوبارہ ہندوؤں کا تعصب مسلمانوں کا راستہ روکے ہوئے ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو سوال یہ ہے کہ امریکہ جیسے آزاد ملک میں مسلمان کیوں ہندوؤں سے پیچھے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قدیم جناح سے لے کر جدید جناح تک جن لوگوں نے مسلمانوں میں اس قسم کا ذہن بنایا وہ مسلمانوں کے نادان دوست تھے، اور مشہور مقولہ کے مطابق، نادان دوست دشمن سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

مسٹر صغیر اسلم صاحب نے بتایا کہ ۱۹۸۸ میں اسلامک سوسائٹی میں عید کے دن تقریر کی

تقریباً پانچ ہزار مسلمان تھے۔ انھوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ مجھے امریکی ہونے پر فخر ہے۔ یہ ہمارا ملک ہے۔ ہم کو اس سے محبت کرنا چاہئے۔ اس کے بعد ہی اس ملک میں اسلام انشاء اللہ پھیل سکتا ہے:

I am proud to be an American Muslim. This is our country and we must love this country. Only then, Insha Allah, Islam will spread in America.

لوگوں نے ان الفاظ پر سخت برہمی کا اظہار کیا۔ لوگوں نے کہا کہ امریکہ تو ایک اسلام دشمن ملک ہے۔ پھر ہم اس سے محبت کیسے کر سکتے ہیں۔ صغیر اسلم صاحب نے کہا کہ اگر آپ سچ مچ ایسا ہی سمجھتے ہیں تو سب سے پہلے آپ کو چاہئے کہ امریکہ میں اپنی شہریت کو ختم کر کے یہاں سے واپس چلے جائیں۔ امریکی شہریت کے دستاویز پر دستخط کرنا اور امریکہ کے ساتھ وطنی تعلق قائم نہ کرنا دو متضاد روش ہے۔ یہ دوہرا معیار ہے، اور دوہرے معیار کا آدمی کبھی کسی ملک میں اسلامی دعوت کا کام نہیں کر سکتا۔

صغیر اسلم صاحب کے دادا چودھری محمد عیسیٰ (م ۱۹۴۸) بہت سمجھدار آدمی تھے۔ صغیر اسلم صاحب نے بتایا کہ ان کے دادا کہا کرتے تھے کہ دوسروں کی اچھائی اور اپنی برائی کو دیکھو۔ یہ دو لفظ میں نہایت اعلیٰ اصول ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر صرف یہی دو لفظ کا اصول لوگ پکڑ لیں تو سارے جھگڑے اپنے آپ ختم ہو جائیں۔ آج ہر طرف جو جھگڑے ہیں اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ آج لوگوں کا مزاج اس کے برعکس ہو گیا ہے۔ آج لوگوں کا حال یہ ہے کہ اپنا معاملہ ہو تو وہ صرف اچھائی کو دیکھیں گے اور دوسرے کا معاملہ ہو تو صرف برائی کو۔

موجودہ سفر میں میری ملاقات ایک امریکی مسلمان سے ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ یہاں ہم لوگوں کا سب سے بڑا مسئلہ بچوں کی آزادی ہے۔ مثلاً انھوں نے بتایا کہ پچھلی رات کو ۱ بجے میرے لڑکے کے پاس اس کے ساتھی کا ٹیلی فون۔ وہ اس کو ایک پارٹی میں بلا رہا تھا۔ میرے لڑکے نے فوراً گاڑی اٹھائی اور روانہ ہو گیا۔ میں جانتا ہوں کہ وہاں لڑکے اور لڑکیاں مل کر تفریح کرتے ہیں، شراب پیتے ہیں، وغیرہ۔ یہاں کے نظام کی وجہ سے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میرا خون کھولتا رہا۔ مگر میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ بے بسی کے ساتھ اس کو برداشت کروں۔

میں نے کہا کہ آپ ایسا کیجئے کہ ہر سال اپنے بچوں کو مہینہ دو مہینہ کے لئے اپنے سابقہ وطن میں

بھیج دیجئے۔ وہاں وہ اردو سیکھیں گے اور اسلامی ماحول میں رہیں گے۔ اس طرح ان کی اصلاح ہوتی رہے گی۔ انھوں نے بتایا کہ یہ بھی سخت مشکل ہے۔ پچھلے سال میں اپنے بچوں کو لے کر وطن گیا۔ مگر وہاں کے ماحول میں وہ رہ نہیں سکے۔ وہاں کا پانی پی کر ان کا پیٹ خراب ہوگیا۔ وہاں کے بیت الخلا میں انھوں نے جانے سے انکار کر دیا۔ اس طرح کے مختلف مسئلے پیش آئے۔ وہاں جب تک میں تھا ان کو لے کر بس ڈاکٹروں کے یہاں دوڑتا رہا۔

اس قسم کے عجیب عجیب مسائل ہیں جن میں یہاں کے مسلمان مبتلا ہیں۔ ان مسائل کی کم از کم ایک وجہ ان کا مصنوعی معیار زندگی ہے۔ یہاں ہر شخص مصنوعی طور پر اپنا معیار زندگی بڑھا لیتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں وہ طرح طرح کے مصنوعی مسائل میں مبتلا رہتا ہے۔

یہاں آپ کسی سے ملاقات کے لئے جائیں تو وہ ایک شاندار گھر میں آپ کا استقبال کریگا لیکن یہ گھر سودی قرض پر ہوگا۔ یہاں تمام لوگ سودی قرض پر مکان خریدتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکہ کے لائف اسٹائل کے مطابق، کوئی آدمی اپنا جو اسٹیٹس سمجھتا ہے، اس سے مطابقت رکھنے والا گھر وہ نقد رقم دے کر خرید نہیں سکتا۔ اس لئے وہ سودی قرض لے کر مکان خریدتا ہے جو بہت آسانی سے اس کو مل جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ کما کما کر ساری زندگی اس کی قسط مع سود ادا کرتا رہتا ہے۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جو گھر یا زندگی کا جو ڈھانچہ سارا کا سارا سود کے اوپر بنا ہو اس کے اندر رہنے والے بچوں میں صالح مزاج کیوں کر پرورش پا سکتا ہے۔

اس مسئلہ کا حل کیا ہے، وہ اس وقت میری سمجھ میں آیا جب کہ میں نے جانا کہ جناب صغیر اسلم صاحب ان انتہائی چند مستثنیات میں سے ہیں جو ایسے گھر میں رہتے ہیں جو انھوں نے نقد ادائیگی کی بنیاد پر حاصل کیا ہے، اس میں سود کی آمیزش شامل نہیں۔ ایسا کیوں کر ممکن ہوا۔ اس طرح کہ اپنے اسٹیٹس کے اعتبار سے انھیں ۲۰ لاکھ ڈالر کے مکان میں رہنا چاہئے تھا مگر وہ صرف دو لاکھ ڈالر قیمت کے مکان میں رہتے ہیں۔

امریکی نظام میں سود سے بچنے کی قیمت یہ ہے کہ آدمی کے اندر یہ جرأت ہو کہ وہ بظاہر کم تر معیار حیات پر اپنے کو راضی کرے۔ وہ اس کی پروانہ کرے کہ لوگ اس کے بارہ میں کیا کہیں گے۔ اس کے اندر یہ بلند رنگا ہی ہو کہ وہ اپنے آپ کو خود اپنی نظر سے دیکھے نہ کہ دوسروں کی نظر سے۔

کچھ لوگ جو انڈیا اور پاکستان سے آئے ہیں، انھوں نے کہا کہ ہم اپنی اگلی جنریشن کو کھو رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ عربی کا ایک مثل ہے کہ تعرف الأشیاء بأضدادھا (چیزیں اپنے ضد سے پہچانی جاتی ہیں)، اس حیثیت سے غور کیجئے تو یہاں بھی ایک ضد موجود ہے اور ان دونوں کا تقابلی مطالعہ کر کے آپ معاملہ کو سمجھ سکتے ہیں۔

یہ ضد آپ لوگ خود ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ ہم اپنی اگلی جنریشن کو کھو رہے ہیں۔ مگر آپ لوگ اپنی پچھلی جنریشن، تو پھر بھی ضائع ہونے سے بچی ہوئی ہے۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب اگلی نسل ضائع ہو رہی ہے تو پچھلی نسل کس طرح محفوظ ہے۔ اس تقابلی مطالعہ کی ضرورت اس لئے ہے کہ آپ محفوظ نسل کے کیس کو سمجھ کر اس کو ضائع ہونے والی نسل پر استعمال کر سکتے ہیں۔

اس بات کو سادہ طور پر اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ پچھلی نسل کی پرورش "اردو کلچر" میں ہوئی تھی اور نئی نسل کی پرورش "انگلش کلچر" میں ہو رہی ہے۔ ہر زبان الگ الگ مذہب اور روایات کی نمائندہ ہوتی ہے۔ انگلش اگر مادی تہذیب میں رچی بسی ہے تو اردو روحانی تہذیب میں رچی بسی ہوئی ہے۔ اگر آپ اپنی اگلی نسل کو اپنے جیسا دیکھنا چاہتے ہیں تو آپ کو یہ انتظام کرنا ہوگا کہ ان کی پرورش بھی آپ والے کلچر میں ہو۔ اس کے بغیر اگلی نسلوں کی حفاظت ممکن نہیں۔

۲۸ دسمبر کو کیلی فورنیا کے انگریزی میگزین آور ٹائمس (Our Times) کے اڈیٹر مسٹر تشبیہ سید نے تفصیلی انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا تعلق زیادہ تر موجودہ زمانہ میں اسلام اور مسلمانوں کے مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے دانشور یہ کہتے ہیں کہ مسلم ملکوں میں جو لوگ حکومت کے عہدہ پر ہیں وہ سب اسلام کے مخالف ہیں اور مغربی طاقتوں کے ایجنٹ ہیں۔ یہ نظریہ سید جمال الدین افغانی کے زمانہ سے چل رہا ہے۔ مگر میں اس کو سراسر بے معنی سمجھتا ہوں۔

یہ درست ہے کہ موجودہ مسلم حکمراں کچھ مسلم تنظیموں پر تشدد کر رہے ہیں، مگر اس کی ذمہ داری خود ان مسلم تنظیموں پر ہے۔ یہ لوگ مسلم حکمرانوں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی تحریک چلا رہے ہیں۔ اور جب بھی کسی کے اقتدار کے خلاف تحریک چلائی جائے تو وہ یہی کرتا ہے۔ مسلم اداروں میں لوگوں کو چھوٹے چھوٹے اقتدار حاصل ہیں۔ اگر آپ ان کو ان کے مقام سے ہٹانے کی تحریک چلائیں تو وہاں بھی آپ کا وہی انجام ہوگا جس کی شکایت آپ سیاسی حکمرانوں سے کر رہے ہیں۔

ترک کلام

دہلی کے ایک حاجی جناب صلاح الدین صاحب اپنی اہلیہ اختر سلطانہ صاحبہ کے ساتھ حج کے فریضہ سے فارغ ہوکر جون ۱۹۹۴ میں اپنے وطن واپس آئے۔ اس کے بعد انھوں نے بہشتی زیور کا ایک خصوصی نسخہ لوگوں کے درمیان تقسیم کیا۔ یہ ایک مفید اصلاحی طریقہ ہے اور بلاشبہ قابل تعریف ہے۔

۱۹۴۷ سے پہلے کے دور میں ہمارے یہاں یہ حال تھا کہ ہر مسلمان کے گھر میں قرآن کے بعد دوسری کتاب جو ضرور موجود رہتی تھی وہ مولانا اشرف علی تھانوی رح کی بہشتی زیور تھی۔ اب نئی نئی چیزوں کے چلن نے اس رواج کو ختم کر دیا ہے۔ اس رواج کا یہ فائدہ تھا کہ گھر کی عورتیں اور بچے شروع ہی سے دین کی ضروری باتیں سنتے اور پڑھتے تھے۔ زندگی کے بارہ میں اسلامی آداب ان کے ذہن میں اس طرح بیٹھ جاتے تھے کہ وہ اس کی خلاف ورزی کا تصور نہیں کر سکتے۔

بہشتی زیور کا جو نسخہ ہمارے سامنے ہے، اس کے ٹائٹل پر لکھا ہوا ہے — اس مجموعہ میں مستورات کی تمام ضروریات، عقائد و مسائل، اخلاق و آداب معاشرت اور تربیت اولاد وغیرہ مذکور ہیں۔ ۸۰۰ صفحہ کی اس کتاب میں یہ تمام باتیں نہایت سادہ زبان میں بتا دی گئی ہیں۔ اس کی ورق گردانی کرتے ہوئے میری نظر اس عنوان پر پڑی: "بولنا چھوڑنا" اس عنوان کے نیچے درج تھا:

"فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ کسی مسلمان کو حلال نہیں کہ اپنے بھائی مسلمان کے ساتھ تین دن سے زیادہ بولنا چھوڑ دے اور اسی حالت میں مر جائے تو وہ دوزخ میں جائے گا۔ (۴۲۸)

یہ حدیث مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ مذکورہ الفاظ ابوداؤد کی روایت میں ہیں۔ آج یہ اخلاقی برائی گھر گھر میں پائی جاتی ہے۔ دو مردوں یا عورتوں کے درمیان کوئی خلاف مزاج بات ہوئی، اس کے بعد دونوں ایک دوسرے سے منھ پھیر لیں گے اور سلام و کلام ترک کر دیں گے۔ یہ فعل نہ صرف غیر اخلاقی اور غیر انسانی ہے بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ جو عورت یا مرد تین دن گزرنے کے بعد بھی بول چال بند رکھیں اور اسی حال میں ان پر موت آجائے تو سخت اندیشہ ہے کہ مرنے کے بعد وہ حدیث کے مطابق، اپنے آپ کو جہنم کی آگ میں گرا ہوا پائیں گے۔

رواداری کا اصول

جنوری ۱۹۹۵ کی پہلی تاریخ کو تمام اخباروں میں یہ خبر تھی کہ اقوام متحدہ نے ۱۹۹۵ کے سال کو رواداری کا سال (year of tolerance) قرار دینے کا اعلان کیا ہے۔ اقوام متحدہ کے ہیڈ کوارٹر نیویارک سے جاری ہونے والے اعلانیہ میں کہا گیا تھا کہ اپنے عمل، اپنے عقیدہ اور اپنی رائے میں روادار ہونا وہ سب سے بڑا عامل ہے جس کے ذریعہ پر امن دنیا تعمیر کی جا سکتی ہے۔

موجودہ زمانہ میں جگہ جگہ نسلی ٹکراؤ، اقلیتوں کے خلاف امتیاز اور پناہ گزینوں کے خلاف نفرت کا اظہار ہو رہا ہے۔ اس کا واحد حل رواداری ہی ہے۔ نسل پرستی اور مذہبی انتہا پسندی بہت سے ملکوں میں امتیازی سلوک تک پہنچ گئی ہے۔ ان لوگوں کو ڈرایا دھمکایا جا رہا ہے جو مختلف نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ اس طرح ان مصنفوں اور صحافیوں کے خلاف تشدد کے واقعات ہو رہے ہیں جو اظہار خیال کی آزادی کے حق کو استعمال کرنا چاہتے ہیں۔

اکیسویں صدی کی آمد کے موقع پر یہ زبردست چیلنج ہمارے سامنے ہے اور اس کا واحد حل رواداری ہے۔ ناروا داری صرف مسائل میں اضافہ کرتی ہے۔ وہ مسائل کو ختم نہیں کرتی۔ ناروا داری اگر زیادہ بڑھ جائے تو وہ عالمی امن کے لئے ایک زبردست خطرہ بن جائے گی (ہندستان ٹائمس

1995 as year of tolerance

The United Nations has proclaimed 1995 as the Year of Tolerance, saying the ability to be tolerant of the actions, beliefs and opinions of others is a major factor in promoting world peace. Amid the resurgence of ethnic conflicts, discrimination against minorities and xenophobia directed against refugees and asylum-seekers, tolerance is the only way forward, said the statement of the United Nations Educational, Scientific and Cultural Organisation, (UNESCO). It said, racism and religious fanaticism in many countries had led to many forms of discrimination and the intimidation of those who hold contrary views. Violence and intimidation against authors, journalists and others who exercise their freedom of expression, were also on the increase along with political movements which seek to make particular groups responsible for social ills such as crime and unemployment. Intolerance is one of the greatest challenges we face on the threshold to the 21st century, said the UNESCO statement. Intolerance is both an ethnic and a political problem. It is a rejection of the differences between individuals and between cultures. When intolerance becomes organised or institutionalised it destroys democratic principles and poses a threat to world peace.

The Hindustan Times, January 1, 1995.

یکم جنوری ۱۹۹۵)

اقوام متحدہ کا یہ اعلان نہایت صحیح اور بروقت ہے۔ آج دنیا کو سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہی رواداری یا ٹالرنس ہے۔

زندگی کی حقیقتوں میں سے ایک حقیقت یہ ہے کہ انسان اور انسان کے درمیان فرق ہوتا ہے۔ یہ فرق ہر سطح پر پایا جاتا ہے۔ خواہ کوئی خاندان ہو یا کوئی سماج ہو یا کوئی ملک ہو، ہر جگہ ایک اور دوسرے میں فرق اور اختلاف ضرور پایا جائے گا۔ اب سوال یہ ہے کہ اس فرق اور اختلاف کی موجودگی میں اتحاد اور میل ملاپ کس طرح پیدا کیا جائے۔

کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ اتحاد کا ماحول اگر بنانا ہے تو اختلافات کو مٹا دینا ہوگا۔ مگر یہ رائے غلط ہے، کیوں کہ وہ قابل عمل نہیں۔ اگر آپ پھول کے ساتھ کانٹے کو پسند نہ کرتے ہوں تو آپ ایسا نہیں کر سکتے کہ کانٹوں کو توڑ کر کانٹوں کا خاتمہ کر دیں۔ کیوں کہ آپ ڈالی کا ایک کانٹا توڑیں گے تو اس کی جگہ دوسرا کانٹا نکل آئے گا۔ حتی کہ اگر آپ تمام پھولوں پر بلڈوزر چلا دیں تب بھی جو بنیاد رہ گئی اگے گا اس میں دوبارہ پھول کے ساتھ کانٹے بھی ضرور موجود ہوں گے۔

اس دنیا میں کانٹوں کو گوارا کر کے ہی پھول کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اختلافات کو برداشت کر کے ہی پر امن سماج بنایا جا سکتا ہے۔ اس دنیا میں اختلاف کے باوجود متحد ہونے سے اتحاد حاصل ہوتا ہے۔ نہ کہ اختلاف کو مٹا کر متحد ہونے سے۔ کیوں کہ اختلاف کو مٹانا سرے سے ممکن ہی نہیں۔ امن کی زندگی کو حاصل کرنے کا واحد راز ہے، بے امنی کو گوارا کرنا۔

دنیا میں فرق اور اختلاف ہونا کوئی برائی کی بات نہیں۔ یہ ایک مثبت خصوصیت ہے اور اس کے بہت سے بڑے بڑے فائدے ہیں۔ باغ حیات کی خوشنمائی کے لئے ضروری ہے کہ اس میں اتحاد کے پھول کے ساتھ اختلاف کا کانٹا بھی پایا جائے۔

اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ انسانوں میں اعلیٰ اخلاقیات کی تربیت ہوتی ہے۔ اپنے ہم خیال لوگوں کے درمیان اگر آپ خوش اخلاق ہوں تو آپ نے محض ابتدائی اخلاق کا ثبوت دیا۔ لیکن اگر آپ ان لوگوں کے درمیان خوش اخلاقی کا رویہ اختیار کریں جو آپ سے الگ خیال رکھتے ہیں یا آپ کے ناقد ہیں تو آپ نے یہ استحقاق حاصل کیا کہ آپ کو اعلیٰ اخلاقی سلوک کا کریڈٹ دیا جائے۔

اسی طرح اگر سماج میں تمام لوگ بالکل ایک رائے کے ہوں۔ ان میں کوئی اختلافی بحث نہ پیدا ہوتی ہو تو ایسا سماج پتھر کے اسٹیچو کا سماج بن جائے گا۔ اس کے درمیان رہنے والوں کی فکری ترقی رک جائے گی۔ فکری ترقی ہمیشہ افکار کے ٹکراؤ کے درمیان ہوتی ہے۔ پھر جہاں افکار کا ٹکراؤ ہی نہ ہو وہاں فکری ترقی کس طرح ہو سکتی ہے۔

نزاع اور اختلاف کے مقابلہ میں رواداری کا طریقہ اختیار کرنا کوئی انفعالی صفت نہیں۔ یہ عین ایجابی صفت ہے۔ زندگی کی تعمیر میں اختلافات کا نہایت اہم رول ہے۔ اختلافات کے عمل کے دوران ہی اعلیٰ انسانی شخصیت بن کر تیار ہوتی ہے۔ اگر انسانی سماج سے اختلاف کی حالت کو ختم کر دیا جائے تو اس کے بعد اعلیٰ شخصیتوں کا بننا بھی یقینی طور پر رک جائے گا۔

اس دنیا میں کوئی بھی انسان کامل نہیں ہوتا۔ ہر آدمی کا یہ حال ہوتا ہے کہ اس میں ایک صفت ہوتی ہے تو دوسری صفت اس کے اندر نہیں ہوتی۔ یہ بھی ایک سبب ہے جس کی وجہ سے لوگوں کے درمیان فرق اور اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔

مگر اجتماعی زندگی کے لئے یہ اختلاف ایک رحمت ہے۔ کیوں کہ اسی اختلاف کی بنا پر یہ ممکن ہوتا ہے کہ ایک آدمی کی کمی کو دوسرا آدمی پورا کرے۔ ایک کی خصوصیت دوسرے کے کام آئے۔ اگر لوگوں کے اندر ایک دوسرے کے اختلاف کو گوارا کرنے کا مزاج ہو تو یہ اختلاف مجموعی انسانی ترقی کا ایک طاقتور وسیلہ بن جائے گا۔

۱۹۴۷ کے بعد جب انڈیا میں پہلی آزاد حکومت بنی تو اس میں دو اہم لیڈر شامل تھے۔ ایک پنڈت جواہر لال نہرو، دوسرے سردار ولبھ بھائی پٹیل۔ پنڈت نہرو کے اندر مغربیت تھی اور سردار پٹیل کے اندر مشرقیت۔ اس بنا پر دونوں لیڈروں میں اکثر رائے کا اختلاف ہو جاتا تھا۔ مگر یہ اختلاف قوم کے لئے نہایت مفید ثابت ہوا۔ کیوں کہ پنڈت نہرو کی صلاحیت سے سردار پٹیل کی کمی پوری ہوئی، اور سردار پٹیل کی صلاحیت پنڈت نہرو کی کمی کو پورا کرنے کا ذریعہ بن گئی۔

یہ ایک قریبی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رائے اور طبیعت کا اختلاف انسانیت کی عمومی ترقی کے لئے کتنا زیادہ ضروری ہے۔

رواداری کی خصلت آدمی کو اس سے بچاتی ہے کہ وہ اپنے وقت اور اپنی صلاحیت کو

غیر ضروری چیزیں ضائع کرنے لگے۔ جب آپ کسی دوسرے کی خلاف مزاج بات سے منفی اثر قبول کر لیں تو آپ کا ذہنی اعتدال بگڑ جائے گا۔ اس کے برعکس جب اس طرح کی صورت پیش آنے پر آپ اس کا منفی اثر نہ لیں تو آپ کا ذہنی اعتدال پوری طرح برقرار رہے گا۔ آپ اپنا ایک لمحہ کھوئے بغیر ایک نارمل انسان کی طرح ہمیشہ اپنا کام جاری رکھیں گے۔ رواداری اور تحمل کی پالیسی آپ کی کارکردگی کی عمر کو بڑھاتی ہے اور نارواداری اور عدم تحمل کا رویہ آپ کی کارکردگی کی عمر کو گھٹا دیتا ہے۔

رواداری یا ٹالرنس کوئی مجبورانہ فعل نہیں، وہ زندگی کا ایک مثبت اصول ہے۔ یہ ایک اعلیٰ انسانی کردار ہے۔ کسی سماج میں روادار انسانوں کا ہونا ایسا ہی ہے جیسے کسی باغ میں پھول کا ہونا۔ پھول کے بغیر باغ نہیں، اسی طرح روادار انسانوں کے بغیر ترقی یافتہ سماج نہیں۔

WOMAN IN ISLAMIC SHARI'AH

By Maulana Wahiduddin Khan

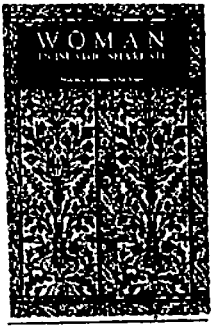

The contents of this book are as follows:

1. Qur'an and Hadith
2. The Qualities of a Believing Woman
3. Womanhood in Islam
4. The Status of Woman
5. Muslim Women
6. The Rights of Husband and Wife
7. Polygamy and Islam
8. Dowry
9. Hijab in Islam
10. Concerning Divorce
11. Success in Marriage

22 × 14.5 cm, 150 pages. ISBN 81-85063-76-1, Rs. 65

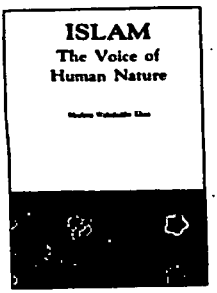

ISLAM: THE VOICE OF HUMAN NATURE

By Maulana Wahiduddin Khan

Only God-centred religion is real and in harmony with man's nature. But this truth does not occur to him until the hour of crisis and peril is upon him. A man may have any religion, or any material props he chooses, but, in moments of real crisis, it is to God that he calls out for help. Such an experience, which we all go through at one time or another in our lives, is a clear indication that the God-centred religion is the only true one. As such, it should pervade man's entire existence. Any religion other than this will fail him in his hour of need, in the Hereafter, just as ordinary, everyday means of support so often do in moments of crisis in this world.

22 × 14.5 cm, 64 pages. ISBN 81-85063-74-5, Rs. 30

آل انڈیا ریڈیو بمبئی سے ۳ مارچ ۱۹۹۵ کو نشر کیا گیا۔

خبرنامہ اسلامی مرکز

۱ ۳۰ دسمبر ۱۹۹۴ کو زی ٹی وی کی ٹیم اسلامی مرکز میں آئی۔ اس نے صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو ویڈیو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر رزرویشن کے مسئلہ سے تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ ریزرویشن کسی بھی کمیونٹی کے مسئلہ کا حل نہیں ہے۔ کیوں کہ وہ قانون قدرت کے خلاف ہے۔ نہرو گورنمنٹ نے ہندستان کے صنعتی گروپ کو پروٹکشن دیا۔ مگر ملکی صنعت ترقی نہ کر سکی۔ چنانچہ اب حکومت اس پالیسی کو چھوڑ کر کامپٹیشن کی پالیسی اختیار کر رہی ہے۔ مسلمانوں کو بھی اس فطری حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے محنت کے اصول کو اختیار کرنا چاہئے۔ رزرویشن کی بے فائدہ مانگ میں اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔

۲ ۳ - ۶ جنوری ۱۹۹۵ کو گوہاٹی میں ایک نیشنل سیمنار ہوا۔ اس کا موضوع نارتھ ایسٹ علاقہ کے مسائل پر غور کرنا تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اور موضوع پر اپنا تعمیری نقطۂ نظر پیش کیا۔ اس کی تفصیلات انشاء اللہ سفر نامہ کے تحت شائع کر دی جائے گی۔

۳ ۸ جنوری ۱۹۲۵ کو ہیلی روڈ (نئی دہلی) پر تعلیم یافتہ افراد کا ایک اجتماع ہوا۔ اس کا موضوع یہ تھا کہ نئے انڈیا کی تعمیر و تشکیل کس طرح کی جائے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور موضوع سے متعلق اپنے تعمیری خیالات تفصیل کے ساتھ پیش کئے۔ لوگوں نے اتفاق کرتے ہوئے اسی لائن پر کام کرنے کا عزم کیا۔

۴ ہندی روزنامہ جن ستا کے نمائندہ مسٹر شمس طاہر خان اور مسٹر ہریش لاکھیرا نے ۱۹ جنوری ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر مسلمانوں کے تعلیمی مسئلہ سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے تعلیمی پچھڑاپن کا کوئی بھی تعلق مذہب سے نہیں ہے۔ اس کی تمام تر ذمہ داری موجودہ زمانہ کے نااہل لیڈروں پر ہے جنھوں نے مسلمانوں کو غیر ضروری مسائل میں الجھایا اور ان کے اندر تعمیری ذہن نہیں بننے دیا۔

۵ راشٹریہ سہارا (ہندی روزنامہ) کے نمائندہ مسٹر جوہر عبد اللہ اور مسٹر منوج کنک نے

۲۰ جنوری ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر مسلم مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مسلمانوں کو الکشن میں اپنی پالیسی مقامی حالات کے اعتبار سے بنانا چاہئے۔ انھیں آل انڈیا انتخابی پالیسی نہیں بنانا چاہئے۔

۶ جناب سید شفیع الدین صاحب اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

Respected Maulana Sahab, Assalamu Alaykum. Hope this letter finds you in the best of health. I am sure y ı would have read in the newspapers that the year 1995 has been proclaimed as the year of tolerance by the U.N. When I saw it on the first page of my paper on the very first day of the new year, I was struck by a strange feeling, an illusion, as if on the horizon, from the dizzy height of U.N. headquarter's building, you are waving a huge copy of *Al-Risala* bearing the word "Tolerance" on its cover. Since then I am really a bit uncertain whether this message is proclaimed by the U.N. or it is an echo of your mission coming to the world through the corridors of the greatest international organization! I wish and hope that you would make it the main theme of your writings, specially for English publications, during the current year and unfold the teachings of Islam on the subject of tolerance, avoidance, endurance and patience. This will enlighten people on one hand and probably contribute to your intense cause of *da'wah* as well.

Syed Shafiuddin M.A., New Delhi, 5.1.1995

۷ یو این آئی کے نمائندہ مسٹر اشوک اپادھیائے نے ۲۲ جنوری ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق ملکی مسائل نیز مسلم مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ اختلاف کے مسئلہ کا حل اختلاف کو مٹانا نہیں ہے بلکہ اختلاف کو برداشت کرنا ہے۔ خواہ ایک فیملی کا مسئلہ ہو یا پورے ملک کا مسئلہ، یہی واحد اصول ہے جس کے ذریعہ پر امن زندگی کی تعمیر کی جا سکتی ہے

۸ ہندی روزنامہ راشٹریہ سہارا کے نمائندہ مسٹر شیام سندر سہنا نے ۲۶ جنوری ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس مسئلہ سے تھا کہ انڈیا اور پاکستان کے تعلق کو کس طرح بہتر بنایا جائے۔ اور ہندو مسلم نفرت کو کس طرح ختم کیا جائے۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ یہ مسائل بے سمجھی کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں، اور سمجھداری کے ذریعہ ان کو ختم کیا جا سکتا ہے۔

۹ بھارتیہ ودیا بھون کے تحت بمبئی میں ۲۹ - ۳۰ جنوری ۱۹۹۵ کو ایک کانفرنس ہوئی۔ اس

کا موضوع تھا: ملک میں اقتدار پر مبنی سماج کی تعمیر۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور صدارتی خطبہ کے تحت اپنے خیالات پیش کئے۔ اس کی روداد انشاء اللہ سفرنامہ کے تحت شائع کر دی جائے گی۔

۱۰ ہندی ہفت روزہ پانچ جنیہ کے سب اڈیٹر مسٹر ہمارا ج کرشن بھرت نے ۲ فروری ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا موضوع یہ تھا کہ "میں مسلمان کیوں ہوں"۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ گیتا کے دو حصے ہیں، ایک اس کی اخلاقی تعلیمات ہیں۔ اس اعتبار سے مجھے اس سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ دوسرا حصہ تھیالوجی کا ہے۔ اس سے مجھے اختلاف ہے۔ کیوں کہ اس میں وحدت وجود کی تعلیم ہے، جبکہ میں اسلام کے مطابق توحید کو مانتا ہوں۔

۱۱ نو بھارت ٹائمس (ہندی) کے رپورٹر مسٹر گلشن رائے کھتری نے ۳ فروری ۱۹۹۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق اقلیتوں کے مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مسلمان بہت سے مسائل سے دوچار ہیں۔ مگر یہ تمام مسائل خود مسلمانوں کے نااہل لیڈروں کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ جس دن مسلمان اپنے نااہل لیڈروں سے چھٹکارا پالیں گے اسی دن ان کے تمام مسائل بھی حل ہو جائیں گے۔

۱۲ پنچایت مومنٹ کے زیر اہتمام ۳ فروری ۱۹۹۵ کو جواہر لال نہرو یونیورسٹی (نئی دہلی) میں ایک نیشنل سمینار ہوا۔ اس میں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر سمینار میں شرکت کی اور خطاب کیا۔ خطاب کا خلاصہ یہ تھا کہ محض سسٹم کے بدلنے سے ہمارے حالات نہیں بدل سکتے۔ اصل مسئلہ لوگوں کا ذہن بدلنا ہے۔ اس کے لئے ماس ایجوکیشن کی ضرورت ہے۔ مسٹر جیٹھ ملانی، جنرل اورورا، فادر گریگوریوز وغیرہ نے بھی تقریریں کیں۔

۱۳ مدراس کے اسلامک فاؤنڈیشن ٹرسٹ نے اسلام اور عدل اجتماعی (الرسالہ جنوری ۱۹۹۴) کو تمل زبان ترجمہ کر کے شائع کیا ہے۔ اس سے پہلے اور بھی کچھ کتابیں تمل میں شائع ہو چکی ہیں۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs 70	ایک سال	$20 / £10	$10 / £5
دو سال	Rs 135	دو سال	$35 / £18	$18 / £8
تین سال	Rs 200	تین سال	$50 / £25	$25 / £12
پانچ سال	Rs 300	پانچ سال	$80 / £40	$40 / £18
خصوصی تعاون (سالانہ)	Rs 500	خصوصی تعاون (سالانہ)	$100 / £50	

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اردو

تذکیر القرآن جلد اول	200/-
تذکیر القرآن جلد دوم	200/-
اللہ اکبر	45/-
پیغمبر انقلاب	40/-
مذہب اور جدید چیلنج	45/-
عظمت قرآن	30/-
عظمت اسلام	50/-
عظمت صحابہ	7/-
دین کامل	50/-
الاسلام	40/-
ظہور اسلام	40/-
اسلامی زندگی	25/-
احیاء اسلام	20/-
رازِ حیات	50/-
صراطِ مستقیم	40/-
خاتونِ اسلام	50/-
سوشلزم اور اسلام	40/-
اسلام اور عصر حاضر	30/-
الربانیہ	40/-
کاروانِ ملت	45/-
حقیقتِ حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دورِ جدید کا خالق	25/-
حدیثِ رسول	25/-
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	85/-
سفرنامہ (ملکی اسفار)	-
میوات کا سفر	35/-
قیادت نامہ	20/-
راہِ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	60/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-

مطالعۂ سیرت	9/-
ڈائری جلد اول	-
کتاب زندگی	40/-
انوارِ حکمت	-
اقوالِ حکمت	20/-
تعمیر کی طرف	8/-
تبلیغی تحریک	20/-
تجدید دین	20/-
عقلیات اسلام	30/-
مذہب اور سائنس	-
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	8/-
اسلام دین فطرت	7/-
تعمیر ملت	6/-
تاریخ کا سبق	7/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	5/-
تعارف اسلام	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	5/-
راہیں بند نہیں	7/-
ایمانی طاقت	7/-
اتحادِ ملت	7/-
سبق آموز واقعات	7/-
زلزلۂ قیامت	10/-
حقیقت کی تلاش	7/-
پیغمبر اسلام	5/-
آخری سفر	7/-
اسلامی دعوت	7/-
خدا اور انسان	7/-
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	5/-
دینی تعلیم	7/-

حیات طیبہ	7/-
باغ جنت	7/-
نار جہنم	7/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	7/-
مضامین اسلام	30/-
تعدد ازواج	3/-
ہندستانی مسلمان	40/-
روشن مستقبل	7/-
صوم رمضان	7/-
علم کلام	9/-
اسلام کا تعارف	4/-
علماء اور دور جدید	8/-
سیرتِ رسول	
ہندستان آزادی کے بعد	3/-
مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	8/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	7/-
الاسلام یتحدی	85/-

ھندی

سچائی کی تلاش	8/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
پیغمبر اسلام	4/-
سچائی کی کھوج	-
آخری سفر	8/-
اسلام کا پریچے	8/-
پیغمبر اسلام کے مہان ساتھی	8/-
راستے بند نہیں	7/-
جنت کا باغ	8/-
بھوتنی واد اور اسلام	3/-
اتہاس کا سبق	9/-
اسلام ایک سوابھاوک مذہب	7/-

God Arises	85/-
Muhammad The Prophet of Revolution	85/-
Islam As It Is	40/-
God-Oriented Life	60/-
Religion and Science	40/-
Indian Muslims	65/-
The Way to Find God	12/-
The Teachings of Islam	15/-
The Good Life	12/-
The Garden of Paradise	15/-
The Fire of Hell	15/-
Man Know Thyself!	4/-
Muhammad The Ideal Character	5/-
Tabligh Movement	20/-
Polygamy and Islam	3/-
Words of the Prophet	--
Islam the Voice of Human Nature	--
Islam the Creator of Modern Age	--

آڈیو کیسٹ

حقیقتِ ایمان	25/-
حقیقتِ نماز	25/-
حقیقتِ روزہ	25/-
حقیقتِ زکوٰۃ	25/-
حقیقتِ حج	25/-
سنتِ رسول	25/-
میدانِ عمل	25/-
پیغمبرانہ رہنمائی	25/-
اسلامی دعوت کے جدید امکانات	25/-
اسلامی اخلاق	25/-
اتحادِ ملت	25/-
تعمیرِ ملت	25/-
نصیحتِ لقمان	25/-

ویڈیو کیسٹ

حقیقتِ روزہ	150/-

AL-RISAL BOOK CENTRE

1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013, Tel 4611128, Fax 4697333

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

الرسالہ

AL-RISALA BOOK CENTRE
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
Tel : 4611128, 4697333 Fax : 91-11-4697333